قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

دسمبر 2021ء

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



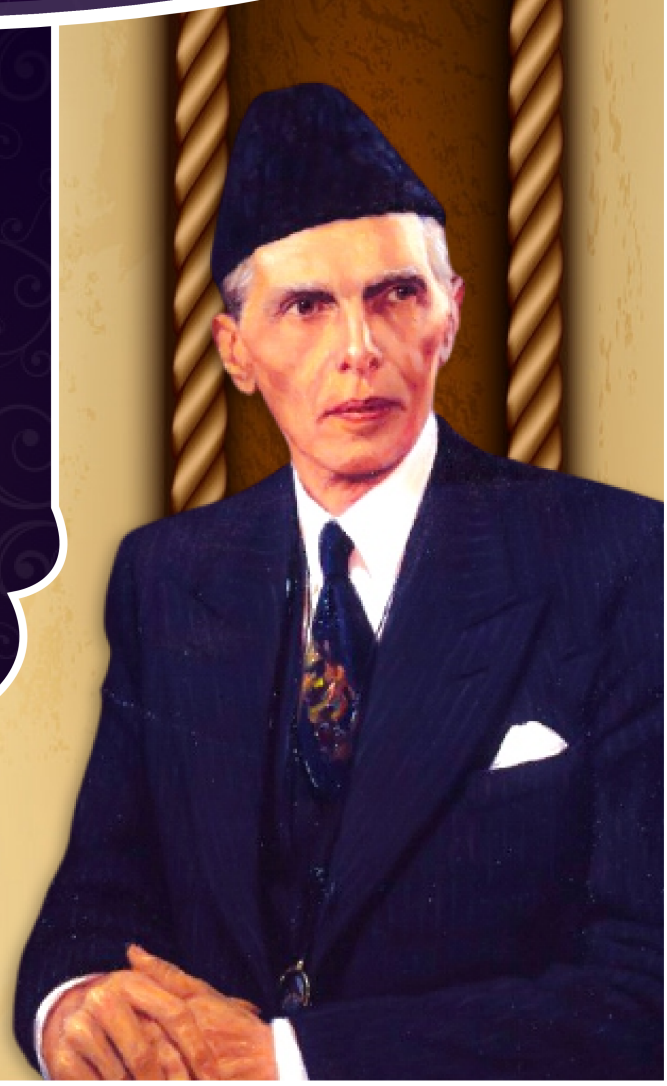


علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

قائداعظم محمد علی جناحؒ

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے اصول اور احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

(عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن، اورینٹ پریس، بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، 8 جنوری 1948ء)



مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ (3:19)۔

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوع انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

دسمبر 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 12

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت	ادارہ	4
ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟	علامہ پرویزؒ	6
اقبالؒ اور جناحؒ	ڈاکٹر حامد اے میاں، امریکہ	26
زکوٰۃ کی مذہبی تعبیر اور اس کی دینی حقیقت	خواجہ ازہر عباس، کراچی	28
گلِ گلاب	امجد محمود، راولپنڈی	35
کچھ باتیں نوجوانوں سے	ادارہ	37
حیران کن عدالت	سید فیروز شاہ گیلانی	45
دوقومی نظر پاکستان والی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	50
تشکیلِ معاشرہ اور قرآنی کردار	ڈاکٹر علی نصیر عباسی	52

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool)	62

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

دسمبر2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 12

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت	ادارہ	4
ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟	علامہ پرویزؒ	6
اقبالؒ اور جناحؒ	ڈاکٹر حامد اے میاں، امریکہ	26
زکوٰۃ کی مذہبی تعبیر اور اس کی دینی حقیقت	خواجہ ازہر عباس، کراچی	28
گلِ گلاب	امجد محمود، راولپنڈی	35
کچھ باتیں نوجوانوں سے	ادارہ	37
حیران کن عدالت	سید فیروز شاہ گیلانی	45
دوقومی نظر پاکستان والی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	50
تشکیلِ معاشرہ اور قرآنی کردار	ڈاکٹر علی نصیر عباسی	52

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool)	62

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن، اورینٹ پریس،
بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور 8 جنوری 1942ء)

قرآنِ کریم کی جامعیت:

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبنؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''بحرِ اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک' ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے

جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں''۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

''اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت' مذہب' تجارت' عدالت' فوج' دیوانی' فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔

اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا۔۔۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے''۔

(تقاریر، جلد دوم، ص:300)

تھیاکریسی نہیں ہوگی!

پاکستان' کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار' جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی' جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(فروری1948ء بہ حیثیتِ گورنر جنرل)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

(درسِ قرآن در تفسیر اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ)

عزیزانِ من! سابقہ درس سورۃ الفاتحہ کی چوتھی آیت کے پہلے ٹکڑے پر مشتمل تھا: اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) اور آج کا درس اس کے اگلے ٹکڑے پر مشتمل ہوگا: وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4)۔ ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔ یعنی اس پوری چوتھی آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''تیری ہی ہم پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں''۔ پرستش والی بات کے متعلق تو میں سابقہ درس میں بتا چکا ہوں۔ اسی میں عبادت کے مفہوم سے اس آیت کے پہلے ٹکڑے کی وضاحت واضح ہوگئی تھی۔ اب یہ جو ''تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں'' اس میں آپ دیکھیے کہ مدد کے لیے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کا انتخاب بذات خود ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں:

جیسا کہ میں بار بار بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے جس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لیے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے، وہ بذاتِ خود قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لیے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو کیوں منتخب کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آ جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر و بیشتر قرآنِ کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض و غایت، حکمت کی ایک جھلک بھی، سامنے آ جائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ان الفاظ کے

> جب تک دعا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا اس وقت تک نہ صرف یہ کہ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ قرآنِ کریم کی یوں کہیے کہ پوری کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے متعلق عجیب قسم کے الجھاؤ پیدا ہوں گے، بعض اوقات کشمکش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے دعا کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔

ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں ترجمہ تو ان الفاظ کا ہو ہی نہیں سکتا' دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا۔

زیرِنظر آیت کے پہلے حصے میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہا گیا تھا۔ اس میں آپ نے دیکھ لیا تھا کہ عبدیت کے معنی ''اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ہے'' اور تعبیر کا لفظ بھی آپ کے سامنے آ گیا تھا جس کے معنی تھے ''ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے بعد انہیں متعینہ قوانین اور قواعد وضوابط کے مطابق صرف کرنا' ان صلاحیتوں کی نشوونما کرنا اور اس کے بعد انہیں ان ساحلوں کے اندر رکھتے ہوئے' صرف کرنے سے نتیجہ نکالنا'' یہ ہم اس سے پہلے والے درس میں بتا چکے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمام چیزیں' تمہارے ایک مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے ہیں' تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے تمہاری منفعت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس میں اعتدال پید اہو جائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اس سے Developed and Balanced Personality (نشوونما یافتہ اور متوازن شخصیت) پیدا ہوجائے گی۔ ہر ایک فرد میں پیدا ہوگی اور ان افراد کے مجموعے سے جو نظام قائم ہوگا' وہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے موجبِ فلاح و بہبود اور امن وسلامتی ہوگا۔ تو گویا اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تیرے قوانین کے تابع صرف کریں گے۔ اس صرف کرنے سے جو چیز پیدا ہوگی وہ اس آیت کے اگلے دو الفاظ: وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ہے۔ سورۃ فاتحہ کے لفظ ''نَسْتَعِیْنُ'' کی وضاحت وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ''نَسْتَعِیْنُ'' کا مادہ ''ع ون'' ہے۔ عربی زبان ''عوان'' اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو' اس کی توانائیاں نشوونما پا چکی ہوں' اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا اس ''استعان'' کے معنی ہوں گے: ''اپنی ذات کے لیے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لیے کسی کی مدد طلب کرنا۔'' اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو اَلْمُسْتَعَانُ (21:112) کہا گیا ہے۔ ''استعان'' کے اس مفہوم کے بعد جب ہم وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہتے ہیں' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''اے خدا! اے اللہ! ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں'' تو اس میں خدا سے چاہنا' طلب کرنا' اپنی آرزو کے پورا کرنے کے لیے اس سے کہنا' یہ تمام چیزیں اس استعان کے اندر آ جائیں گی۔ اس سے آپ دیکھیے گا کہ فوراً آپ کے ذہن میں ''دعا'' کا لفظ آئے گا' دعا کا تصور آئے گا کہ ہم خدا سے ''دعا'' کرتے ہیں کہ ہم ایسے ہوجائیں۔

> ہمارے ہاں ''دعا'' مانگنے سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے۔ اسی کو خدا کے ہاں سے مراد مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور جو اعتراضات اُبھرتے ہیں' میں پہلے انہیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دعا کے تصور یا مسئلہ کا تعلق تقدیر سے بھی ہے۔

نستعین کے مفہوم سے پہلے لفظ دعا کی وضاحت کرنا ضروری ہے

جب تک دعا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا اس وقت تک نہ صرف یہ کہ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ قرآنِ کریم کی یوں کہیے کہ پوری کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے متعلق عجیب قسم کے الجھاؤ پیدا ہوں گے، بعض اوقات کشمکش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے دعا کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے میرے کہنے سے آپ احباب میں سے بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں سے کون ہے جو ''دعا'' کو نہیں سمجھتا، دعا تو ہم ہر روز خدا سے مانگتے ہیں، یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے ساتھ بار بار ہمارے ذہنوں میں، ہماری زبان پہ آتا ہے تو پھر اس کے لیے اتنی لمبی وضاحت کی کیا ضرورت ہے لیکن عزیزانِ من! جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنے بھی الفاظ اور اصطلاحات اس سے پہلے آئی ہیں، ان سب میں یہ بات تھی کہ ہمارے ذہنوں میں اس کے متعلق پہلے سے ایک مفہوم یا ایک تصور متعین تھا لیکن جب عربی زبان اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی وضاحت ہوئی تو یہ نظر آیا کہ ہمارا وہ تصور، نہ تو مفہوم کے اعتبار سے، نہ اسی زبان کے اعتبار سے صحیح تھا اور نہ ہی قرآن کی تعلیم کے اعتبار سے۔ ان تصورات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی، ایک انقلاب آیا اور اسی طرح سے آپ دیکھیں گے کہ جب ''دعا'' کا قرآنی مفہوم سامنے آئے گا تو اس سے بھی آپ کے قلب ونگاہ کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ''دعا'' مانگنے سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے۔ اسی کو خدا کے ہاں سے مراد مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور جو اعتراضات اُبھرتے ہیں، میں پہلے انہیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دعا کے تصور یا مسئلہ کا تعلق تقدیر سے بھی ہے۔ اسے میں نے اپنی تصنیف ''کتاب التقدیر'' [1] میں بھی تفصیل سے لکھا ہے اور پھر جستہ جستہ مقامات پر ''مطالب الفرقان'' [2] کی اب تک چھپنے والی کتب میں بھی، اس کی بعض تفاصیل آئی ہیں لیکن اس درس میں چونکہ یہ بات پہلی دفعہ آئی ہے، اس لیے جو کچھ میں نے وہاں تفصیل سے لکھا ہے، اسے یہاں سمیٹ کر، ملخصاً، آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

لفظ دعا کے متعلق عام طور پر پایا جانے والا تصور اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال:

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ جب دعا کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ہم خدا سے کچھ مانگتے ہیں، کچھ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری یہ طلب پوری کر دے تو اس کے خلاف کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اعتراضات ابھرتے ہیں، سب سے پہلے میں انہیں

---

[1] کتاب التقدیر کا پہلا ایڈیشن اکتوبر 1971ء کو زیورطباعت سے آراستہ وپیراستہ ہو کر منظرعام پر آیا۔ اس میں ''خدا کا تصور'' کے لیے دیکھئے ص: 35 تا 51، اور ''دعا'' کے لیے دیکھئے ص: 359 تا 390 ''کتاب التقدیر'' میں دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا، قابل فہم، بصیرت افروز، حل موجود ہے۔

[2] اس سے مراد ''مطالب الفرقان'' کی پہلی 6 جلدیں سورۃ الفاتحہ سے سورۃ ھود تک پرویزؒ (1903-1985) کی حیات میں ہی طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں جبکہ اس سلسلہ کی ساتویں جلد جو سورۃ حجر تک کا مسودہ آپ کی زندگی میں ہی اکتوبر 1984ء میں صاحبِ فراش ہونے سے قبل مکمل ہو چکا تھا جو بعد میں پھر 1991ء میں شائع ہوا۔

سامنے لاتا ہوں۔ اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے اور یہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق اگر پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے، اب اس کے لیے وہ خود، یا اس کے متعلقین لاکھ دوائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ قسمت کے لکھے کے متعلق بھی تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا ہی کا طے کردہ، خدا ہی کا فیصلہ ہوتا ہے، خدا ہی نے تقدیر مقرر کی ہے، خدا ہی نے اس کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک شخص اتنا بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا، تو پھر دوا کرنے سے کیا حاصل ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے، وہ اٹل نہیں کہلا سکتا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کی رو سے خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے یا اس کے متعلقین نے ہم سے درخواست کی، تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچیے، عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کس قسم کے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے یا اس کے متعلقین نے ہم سے درخواست کی، تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچیے، عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کس قسم کے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے گا تو ہوسکتا ہے کہ بکر جو جھوٹا تھا، وہ زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا خواہ وہ حق پر نہ ہی ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے یعنی زید کی تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس لیے اس نے اس کا ساتھ نہیں

دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قسم کے اعتراضات وارد ہو رہے ہیں اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال حق بات کا ساتھ دے گا تو اول تو یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے، ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہیں رہتا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا ہی نہیں۔

> مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس و بے بس، اور مصیبت زدہ لوگ، دن رات گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی، ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے، مصیبتوں میں، کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔

دعا کے ساتھ تدبر کا عمل بھی:

عزیزانِ من! اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے اور دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے پھر اور دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں۔ بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا تو کیا اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رو سے دعا کے سلسلے میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 2.186 کا مروجہ ترجمہ اور اس سے پیدا ہونے والی دشواری

اگر آپ کے پاس قرآنِ کریم کا نسخہ ہے، تو آپ اس آیت کو خود سامنے لے آیئے۔ وہ آیت ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہوں۔'' اس ترجمہ کی رو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس و بے بس، اور مصیبت زدہ لوگ، دن رات گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی، ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے، مصیبتوں میں، کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا لیکن قطع نظر اس کے کہ ستم رسیدہ، مصیبت

زدہ، برسرِ حق، مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہوسکتا، بڑے دوررس نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو مذکورہ بالا جواب کی رو سے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے، اس لیے اسے نہ اب اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔

اس قسم کی غلط سوچ کا نتیجہ:

غور کیجیے کہ اس قسم کے عقائد ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں کم از کم انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہوسکتا تھا کہ وہ ان کے دست ستم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لیے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں، زیردستوں اور مظلوموں کے لیے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح بھی کریں اور یہ ان کے شکرگزار بھی ہوں۔

دعا کی قبولیت کے لیے خدا کے مقرب بندوں کے وسیلے کی تلاش

عزیزانِ من! اس سے بھی آگے بڑھیے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا، وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر حضرت صاحب کے آستانۂ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا کر ہاتھ باندھے اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لیے دعا کیجیے ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا، برباد ہوجاؤ گا اور یہ سلسلہ حضرت صاحب کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد جسے یہ لوگ وفات نہیں بلکہ وصال کہتے ہیں، یعنی ان کا اپنے محبوب، خدا کے ساتھ جا کر مل جانا، تو ان کی وفات کے بعد ان کے مزار شریف سے وابستہ ہوجاتا ہے، جہاں ان سے سجدوں میں گرگر کر التجائیں کی جاتی ہیں اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں، اس لیے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی، یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لیے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ قرآن کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے، جسے میں نے شروع میں بیان کیا ہے یعنی وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں، میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ، ہمارے دور ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی

الارض یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی اصل آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس کی رو سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے ظاہر ہے یہاں کے بادشاہوں کی طرح، وہ شہنشاہ حقیقی بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے، نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا: جسے چاہا پکڑ لیا، جسے چاہا نواز دیا، جسے چاہا بخش دیا، جسے چاہا باندھ لیا۔

اسی سلسلے میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب اور دربان کھڑے ملتے تھے، پھر اہل دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لیے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج بھی یہی حالت ہے۔ دفتروں کے باہر بیٹھے ہوئے چپڑاسی (Peons) ہی ذریعے بنتے ہیں جس سے درخواست آگے جاتی ہے۔ بہرحال دورِ ملوکیت میں بادشاہ اور بادشاہ کے دربار کا اس قسم کا جو تصور سامنے آیا تو ہم نے یہی نقشہ دربارِ خداوندی کا متعین کر دیا۔ اس کی رو سے خدا تک بات پہنچانے کے لیے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیش نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لیے کسی حضرت صاحب کے وسیلے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ ان کی بات مان لیتا ہے اور ہماری درخواست منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہٖ بادشاہوں کے حضور نذرانے گزارنا پڑتے ہیں یا ان کے مقربین کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔

> وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

خدا کے متعلق ہمارا موجودہ تصور دورِ ملوکیت کا اور مرورِ زمانہ کا پیدا کردہ ہے:

یہ ہے عزیزانِ من! خدا کا وہ تصور جو ہمارے شہنشاہیت کے زمانے میں، ہمارے ذہنوں میں مرتسم کیا گیا اور جس نے رفتہ رفتہ مصدقہ عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ کے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے، تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر و الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور دامانِ طریقت کے وابستہ افراد پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم حضرت صاحب کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (7:194) وہ تمہارے ہی جیسے انسان، خدا کے بندے ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے، ان کے متعلق کہا کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے اور اگر بالفرض محال وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے

(35:14)۔تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں (46:5)۔انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ: اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ (16:21) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں، وہ تمہاری کیا سنیں گے اور تمہاری کیا مدد کریں گے!!

دعا کے اس پیچیدہ مسئلے کا ایک نہایت شافی اور متضاد کیفیات سے ماوراحل

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔سب سے پہلے اسی آیت کو لیجیے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور اس کی وضاحت میں، میں نے اتنا کچھ کہا ہے یعنی وہ آیت جس کے معنی تھے کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، اس کے بعد ہے کہ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّهُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ (2:186) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی، میرے قوانین کی صداقت پر، پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو، میری باتوں کا جواب دو، اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔تم اسے یہ کہتے ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں تو خدا سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں، لیکن پہلے تم میری باتوں کا تو جواب دو۔

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں قرآن کا تفصیلی جواب

یعنی وہ یہ کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا، بتاؤ تم نے ان کے متعلق کیا کیا۔کیا ان پر عمل کیا؟ کیا اس کے مطابق چلے؟ پہلے اس بات کا جواب دو تو پھر میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔غور فرمایا، عزیزانِ من! اسی کی وضاحت میں دوسری جگہ کہا کہ: وَیَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔ایک دوسرے مقام پر سورۃ المؤمن میں ہے کہ تم مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا لیکن اتنی بات سن رکھو کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ (40:60) جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے، ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

جو کچھ میں نے ابھی تک جستہ جستہ مقامات سے کہا ہے، سورۂ آل عمران کی تین چار مسلسل آیتوں میں اسے نہایت وضاحت سے، تسلسل کے ساتھ، بیان کیا گیا ہے۔پہلی آیت (3:189) ہے۔میں آیت قرآنِ کریم سے پڑھتا ہوں اور اس آیت کا مفہوم اپنے ''مفہوم القرآن'' سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پورے قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا ہوا ہے، اس کا نام بھی ''مفہوم القرآن'' ہے۔تو یہ جو آیت میں پیش کروں گا، اس کا مفہوم، مفہوم القرآن ہی سے پیش کروں گا۔ آیت یہ ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی

الْاَلْبَابِ (3:190) جولوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں‘ ان کے لیے کائنات کی تخلیق‘ رات اور دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:119) ان صاحبانِ عقل وبصیرت اور اربابِ فکر ونظر کے لیے‘ جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے‘ بیٹھے‘ لیٹے‘ قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں‘ اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں ‘ کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہۂ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض وغایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔ اب یہ ہے کہ: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:192) جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے‘ اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں‘ ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل وخوار قوموں کا کوئی یار ومددگار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقین محکم رکھے۔ لہٰذا ان اربابِ عقل وبصیرت کی پکار یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۣ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (3:193) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ ”آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ“ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا‘ اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ان اربابِ علم وایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا‘ جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی

> دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ (3:195) خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے لیکن تم یاد رکھو! ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے‘ وہ مرد ہو یا عورت‘ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے‘ عزیزانِ من! خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

ہوں۔ اگلی آیت ہے کہ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (3:194) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے‘ وحی کی رو سے‘ جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے‘ ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتائج مرتب کر کے رہتا ہے۔

> سورۂ رعد میں کہا گیا ہے اور بڑے ہی محاکاتی انداز سے کہا گیا ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا اس شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے‘ پیاس اس کی بجھے گی۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی

عزیزانِ من! دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ (3:195) خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے لیکن تم یاد رکھو! ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے‘ وہ مرد ہو یا عورت‘ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے ‘عزیزانِ من! خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

مومنین کی دعاؤں کی قبولیت کے بعد انبیائے کرام کی دعاؤں کی قبولیت کی نوعیت اور غایت

یہاں تک تو بات عام مومنین کی تھی۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ فرماؤ کہ ان کی قبولیت کو خدا کن باتوں سے مشروط قرار دیتا ہے اور وہ کس طرح سے قبول ہوتی ہیں۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرتِ نوحؑ کے متعلق‘ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو کہا کہ وَلَقَدْ نَادٰىنَا (37:75) نوحؑ نے ہمیں پکارا اور اس کے بعد ہے کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75) اور ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی اس دعا کا جواب کیا دیا گیا۔ ذرا غور سے سنیے‘ جواب تھا کہ فَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا (23:27) ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی۔ اس سے کہا کہ تم اس آنے والے طوفان سے بچنا چاہتے ہو‘ حفاظت چاہتے ہو‘ اس کے لیے تم نے ہمیں پکارا تھا اور اس پکار کا جواب ہم تمھیں دیتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ تم ایک کشتی بناؤ۔ ہو سکتا ہے تم کہو کہ یہ ایک نئی سی چیز ہے‘ مجھے کشتی بنانی نہیں آتی‘ ہم بتائیں گے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے‘ ہمارے زیرِ نگرانی کشتی بناؤ‘ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ لیکن کشتی بناؤ۔ اس طوفان سے حفاظت کی صورت یہی ہے کہ تم کشتی بناؤ‘ کشتی کے ذریعے سے حفاظت ہو گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں‘ عزیزانِ من! نوحؑ نے پکارا۔ جواب ملا کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75) ہم بہترین دعاؤں کا جواب دینے

والے ہیں اور جواب یہ دیا گیا کہ طوفان سے بچنا ہے تو اس کے لیے کشتی بناؤ۔

حضرت نوح کے بعد حضرت موسیٰ کا ذکرِ خیر اور پروگرام کی تکمیل کے لیے استقامت کی تاکید

آگے بڑھیے۔ جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ فرعون [1] کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے متعدد تائیدی اسباب وذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ حضرتِ موسیٰؑ نے خدا سے یہ کچھ مانگا' اس کے جواب میں کہا کہ: قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (20:36) اے موسیٰؑ! جو کچھ تم نے مانگا ہے' تجھے عطا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی' تیری مانگ پوری کر دی' تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (20:42) تم دونوں بھائی موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو' جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دعا کے قبول ہو جانے کی ضمانت بھی دی اور اس کے بعد یہ کہا کہ اسے تم نے بروئے کار لانا ہے اور اس میں ذرا سا بھی تغافل نہ برتنا' تساہل نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے کہ: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (10:89) خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا: فَاسْتَقِيْمَا اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو' کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ غور فرمائیے' عزیزانِ من! ایک نبی سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری دعا ہم نے قبول کر لی اور اس قبولیت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جو پروگرام تمہیں دیا جاتا ہے اس پر جم کر کھڑے ہو جانا' تمہارے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آنے پائے اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی فقط ان کی کامیابی نہیں ہو سکتی یہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنا ہے اور نہایت استقامت سے اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔

جن لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں ان کی عملی زندگی کی حالت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا' عزیزانِ من! کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا' ان کے سلسلوں میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لیے جن طبعی اسباب وذرائع کی ضرورت ہے' انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات واستقامت سے عمل پیرا ہوا جائے' یہ نہیں کہ دعا مانگ لی' خدا نے جواب دیا کہ ہم نے قبول کر لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں کہا گیا ہے اور بڑے ہی محاکاتی انداز سے کہا گیا ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا اس شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے' پیاس اس کی بجھے گی۔ پانی

---

[1] فرعون کے متعلق دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل۔ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص:109 (فٹ نوٹ 1)

کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے کہا ہے کہ: وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (13:14) جو لوگ خدا کے اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جو دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کو پکارتا رہے' دریا کے کنارے پانی بہہ رہا ہے' کنارے پہ کھڑا ہے' دعا بھی مانگ رہا ہے' لیکن آگے بڑھ کر پانی نہیں پیتا۔ تو یہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ خدا کے قانون سے انکار کر رہا ہے۔ خود پانی نہیں پی رہا۔ اس واسطے اس کی' پانی پینے کی یہ دعا' اس کی یہ طلب اور مانگ' قیامت تک پوری نہیں ہوسکتی۔

(27:62) کہو کہ وہ کون ہے جو قلب مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے؟ کس طرح دُور کر دیتا ہے' اس کے لیے کہا کہ: وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ (27:62) وہ تمہیں حکومت و مملک عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔

معاشرے کے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کے مصائب وآلام کے حل کے لیے نظام کی اہمیت اور اس کی افادیت

عزیزانِ گرامیِ قدر! اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی دادفریاد نہیں' ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں' ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں' ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کے جواب میں کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی ہیں' قبول بھی کی جاتی ہیں' ان کی مدد بھی کی جاتی ہے' ان کے دکھ درد کو دور بھی کیا جاتا ہے لیکن اس کا طریقہ کچھ اور ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے۔ اسے غور سے سنیے' عزیزانِ من! برس ہا برس کی محنت شاقہ اور تگ وتاز وپیہم کے بعد مدینے میں جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکے میں محصور تھے' قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ بارِالٰہا! ہماری مدد کر' اور ہمارے لیے ان ظالمین کے جور وستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے وہاں کی جماعت مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نہیں اٹھتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (4:75) کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم ومقہور' بے کس وبے بس' کمزور وناتواں مرد عورتیں بچے کس طرح گڑگڑا کر ہم سے یہ فریاد کر رہے ہیں کہ بارِالٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو سن

نہیں رہے اور اگر سن رہے ہو تو پھر انتظار کس بات کا ہے‘ ان کی امداد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں‘ تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس نالہ وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (4:75)، [1] ۔ وہ ہم سے فریاد کرتے ہیں۔

خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت سے‘ اس حکومت سے‘ اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوا تھا کہ کیا تم ان کی پکار کو سن نہیں رہے؟ اٹھو اور ان کی پکار کا جواب دو‘ ان کی مدد کے لیے آگے بڑھو۔ یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعت مومنین جو‘ اب مدینے میں تھی‘ تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں کی ہوں گی لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لیے وجود میں آیا ہو‘ اس لیے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ ہمت و استقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی بلکہ تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔

> خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب یہ ہو گی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لیے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اپنے فریضے کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہو گا اور اس امر کی کوشش کرنا ہو گی کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔

دیکھیے اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ: اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62) کہو کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے؟ کس طرح دُور کر دیتا ہے‘ اس کے لیے کہا کہ: وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ (27:62) وہ تمہیں حکومت و مملک عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ دوسرے مقام پر اسی جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42:38) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے

[1] اور ہمارے لیے‘ اپنی جناب سے کوئی محافظِ نگران‘ کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

بڑھتے ہیں' اس کے احکام وقوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں' انہی کی روشنی میں اپنے امورِ مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہو' اسے رفاہِ عامہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) سے اشارا اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لیے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی۔

انسانی زندگی کی نفسیات پر معاشرتی خرابیوں اور نظام کی تباہ کاریوں کے اثرات کا نتیجہ:

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے؟ اس کی ضرورت اس غلط معاشرہ میں پیش آتی ہے' جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو' جہاں ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو' جہاں حقدار کو اس کا حق نہ مل سکتا ہو' جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو' جہاں اس شخص کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے' جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے' جہاں افراتفری اور نفسانفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں ' کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے' جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں' جہاں مختلف مریض اس لیے بن آئی موت مر جائیں کہ ان کے پاس علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اس کا گور وکفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ' جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنا پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

لیکن جب معاشرہ صحیح خطوط یعنی مستقل اقدارِ خداوندی پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے' ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردد کے ملتا ہے' نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے' نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے' نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرے میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لیے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے ہیں اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔

اس کسمپرسی اس محتاجی اور اس بیچارگی کے علاج کے لیے حضرت عمر فاروق کا فرمان

عزیزانِ من! اس حقیقت کبریٰ کو حضرتِ عمر فاروقؓ (581-644/45AD) نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا

ہے کہ جوں جوں انسان اس پہ غور کرتا ہے، روح وجد میں آ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ لوگو سن رکھو مجھے خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ مجھے خلافت کا فریضہ اس لیے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔ اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقتیں اس ایک جملے میں چھپی ہیں! کتنی بلند حقیقت ہے جسے اس قدر سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے! مطلب یہ کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لیے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضے کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کرنا ہوگی کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت اس کے مانگنے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔ لہٰذا تم اپنی ضروریات اور اپنی احتیاجات کے لیے خدا سے براہِ راست دعا کرنے کی بجائے اسے مجھ تک پہنچایا کرو۔ یہاں وہ پوری ہو جائیں گی، تمہاری دعا کے خدا تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، البتہ جب یہاں ضرورت پوری نہ ہو اور اگر ایسا وقت آ جائے تو میں اس سے پیشتر اس خلافت کے منصب سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ ہوتی ہے، عزیزانِ من! اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی رہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لیے خدا سے کچھ مانگنا نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں وہ اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں ہیں اور یہ اجتماعی دعائیں مانگی ہی اس مقصد کے لیے جاتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی مصیبت زدہ مظلوم نہ ہو، جس میں عالم گیر انسانیت کے مصائب اور آلام کا علاج ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہیں وہ دعائیں جو جماعت مومنین خدا سے مانگتی ہے۔ اجتماعی دعائیں ایک فرد کے لیے نہیں اور یہ جو آیت ہمارے زیرِ نظر ہے، اس میں بھی کہا گیا ہے کہ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) ہم تجھ سے استعانت چاہتے ہیں۔

آخر کار سوال یہ کہ بیماری میں دعائیں کرتی کیا ہیں یا ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے

یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں انفرادی ہوں، اجتماعی ہوں سوال یہ ہے کہ ان سے بالآخر ہوتا کیا ہے، ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل۔ اس لیے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔ دعا سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا کے بعد اس پروگرام پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس میں جو ''دعا'' درمیان میں آتی ہے اس کا مقصد کیا ہے، کیا وہ بیکار ہے؟

یہ بڑی اہم چیز ہے اور اسے غور سے سنیے کہ اس کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو، تو اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو ابھرتی ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو، اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل

میں آرزو پیدا ہوتی ہے' ایک تقاضا بیدار ہوتا ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

مازِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

> نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔

دنیا میں ہر عمل کی بنیاد آرزو کی رہین منت ہوتی ہے

ہماری زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مقاصد کی تخلیق کرتے چلے جائیں اور اس کے بعد

از شعائے آرزو
تابندہ ایم

ہماری زندگی میں نورانیت اور چمک اس سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے لیے آرزو بیدار ہو۔ یہ شعائے آرزو ہے کہ جس سے ہماری زندگی روشن ہوتی ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا' اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے بچوں کے لیے ایک نظم [1] لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدارس (Schools) کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دعا کے سلسلہ میں علامہ اقبال کی یہ نظم نفسیاتی تبدیلی کو بدلنے کی ایک بنیاد ہے:

اس شعر کے پہلے مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یوں تو بچوں کے لیے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے' وہ بڑی عمیق ہے یعنی جب انسان کی دلی تمنا حروف اور الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے' تو اسے دعا کہا جاتا ہے: جتنی گہری تمنا' اتنی ہی مخلص دعا' جتنی شدید آرزو اتنی ہی پرکیف پکار' دعا۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ہے کہ

قیمت ہر شے زِ اندازِ نگہ

ہر شے کی قیمت نگاہ کے انداز سے ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدل لو' اس کی دنیا بدل جائے گی۔

---

[1] اقبالؒ: بچے کی دعا (ماخوذ) بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص: 48-47

ہر شے کی قیمت آرزو کے بدلنے میں ہی مضمر ہے

ساری دنیا ''من'' کی دنیا ہے:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے　　بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

دوسرے ایک شعر میں ہے کہ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی　　فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے ❶

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) پیدا ہوجاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو اقبالؒ ❷ (1877-1938) نے کہا تھا کہ ''عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام'' وہ شدت آرزو کی ہی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک آرزو کا معیار

آرزو کے سلسلے میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو کس قسم کی ہے؟ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن مومن کے سامنے صحیح آرزو کا جو معیار رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾ (81:29) تمہیں اس کا اختیار ہے کہ جو جی میں آئے، اسے چاہو، لیکن مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی چاہے، جو خدا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔ جس بات کو خدا نے برا قرار دیا ہے، تم بھی اسے برا سمجھو۔ جسے اس نے اچھا کہا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

یہ تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جو خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ لہٰذا سب سے پہلے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے، وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر یہ ویسی نہ ہو تو اسے تبدیل کر کے مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔ تو اس کے اندر پہلی چیز تو یہ آئی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دل میں

---

❶ پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی کتاب ''انسان کے کیا سوچا؟'' کے پہلے ایڈیشن میں خارج میں نہ بہار ہے نہ خزاں، نہ نغمہ ہے نہ فغاں، لکھنے کے بعد یہ شعر اسی طرح سے درج کیا ہے۔ سچ کہا تھا پروفیسر وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب Science and the modern world میں کہ 'نہ پھول اپنی مشام جاں نواز کے لیے درخورِ تحسین ہے، نہ عندلیب اپنے نغمہ دل ربا کے لیے۔ اور نہ آفتاب جہانتاب اپنی نور افگنی کے لیے کسی تعریف و توصیف کا مستحق ہے..... اپنے قصائد کا ممدوح خود اپنے ''دل'' (Mind) کو قرار دینا چاہیے۔ فطرت تو یکسر بے آب و رنگ واقع ہوئی ہے۔ نہ اس میں چنگ و رباب ہے، نہ رنگ و شباب۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اندر ہے۔'' ''حواس (Senses) ذریعہ عمل'' ہیں ''دل (Mind)'' کی دنیا'' کے لیے۔ انسان نے کیا سوچا؟ کے پہلے ایڈیشن کے صفحات 102 تا 104 پڑھیے۔ ❷ بالِ جبریل: عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

صرف آرزو کی بیداری سے مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کسی جگہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں' آپ کے دل میں وہاں جانے کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد اگر آپ اسی طرح گھر میں بیٹھے رہیں' تو آپ اس منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس کے لیے اگر آپ کو ریل میں جانا ہے تو ریلوے ٹائم ٹیبل کنسلٹ کرتے ہیں' گاڑیوں کے اوقات دیکھتے ہیں' انکوائری والوں سے دریافت کرتے ہیں' پھر مقررہ وقت' اور مقررہ تاریخ پر گھر سے چلتے ہیں' اسٹیشن پر پہنچتے ہیں' ٹکٹ خریدتے ہیں' گاڑی کا انتظار کرتے ہیں' صحیح گاڑی میں بیٹھتے ہیں' جو گاڑی سامنے آ جائے اسی میں نہیں بیٹھ جاتے' جو گاڑی آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے اس میں بیٹھتے ہیں اور یہ وہ گاڑی ہے جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دل میں کسی جگہ پہنچنے سے یا آرزو کے بیدار ہونے سے' اور وہاں تک پہنچنے کے درمیان یہ جتنے مراحل آتے ہیں' وہ سارے اس پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں کہ جس سے اس آرزو کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی آرزو' ایسی آرزو ہے جو اس مقصد تک پہنچانے کے لیے دل میں اٹھے۔ یہ خدا نے مستقل اقدار کی رو سے آپ کے لیے' انسان کی اپنی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے' مقرر کیا ہے۔ یہ آرزو بیدار ہو اور پھر اس کے لیے وہ تمام اسباب اور سامان اکٹھا کیا جائے جو اس کے لیے متعین کیا گیا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق اس گاڑی میں سوار ہوا جائے جو آپ کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔

> وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝۲۹ (81:29)
> تمہیں اس کا اختیار ہے کہ جو جی میں آئے' اسے چاہو' لیکن مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی چاہے' جو خدا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ رکھے

داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ممکن ہی نہیں

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''دعا'' سے انسان کے اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی کا پیدا ہونا بڑی اہم چیز ہے۔ کس قدر قابل رشک ہے وہ انداز' جس میں اقبال (1877-1938) نے اتنی بڑی' بلند' عمیق' دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بلیغ اور دل کش انداز تصور میں نہیں آ سکتا۔ آپ بھی سنیے اور میری طرح وجد میں آ جایئے۔ وہ کہتا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

یہاں ''قضا'' سے مراد ''قانونِ خداوندی'' ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کیا بات ہے! کیا کہہ گیا!! اسی کے ساتھ دوسرا شعر ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری مری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

کہا کہ تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی' مگر اس سے یہ ممکن ہے' کہ تو بدل جائے اور یہ جو تبدیلی ہے کہ تو بدل جائے' وہ

قرآنِ کریم کے اندر ڈوبنے سے یعنی اپنی آرزوؤں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے متعلق اقبال نے کیا کیا کچھ کہا ہے!! کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

یہ جب دل کی گہرائیوں کے اندر اتر جاتا ہے تو جہاں دیگر شود۔ [1] اور انسان کے اندر جب وہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارج میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ خارجی انقلاب آ ہی نہیں سکتا جب تک انسان کے اندر داخلی انقلاب پیدا نہ ہو اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے بڑے ہی بلیغ الفاظ میں کہا کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11) یاد رکھو! تم تو ایک طرف، ساری دنیا بھی زور لگا کر دیکھ لے کسی قوم کی حالت میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی تاوقتیکہ اس قوم کے پہلے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو۔ اس کی خارج کی تبدیلی کا دارومدار اس کی داخلی تبدیلی کے اوپر ہے، اس کی نفسیاتی تبدیلی کے اوپر ہے اور یہ ہے جو ''دعا'' سے حاصل ہوتی ہے۔ اس چیز سے انسان کے اندر ایک داخلی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے، دعا کی اہمیت اور غایت۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے۔ یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔ قدم اٹھانے کا مرحلہ بڑا اہم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔ آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لے کر نکلتے ہیں، اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے جس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہو گی لیکن آخر الامر ہو گا یہ کہ نہ صرف آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔ لہٰذا جب آپ نے وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (1:4) کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو کا اظہار کیا اور اس کے لیے اس کے اعانت طلب کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آ جائے۔ اس کے لیے آپ کے دل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ (1:5) ہمیں اس سیدھے راستے کی راہنمائی مل جائے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ یہ سورۃ الفاتحہ کی اگلی یعنی پانچویں آیت ہے اور اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀...❀❀...❀

[1] دنیا بدل جاتی ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصٰفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ڈاکٹر حامد اے میاں، امریکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور جناحؒ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتے ہیں چمن میں دیدہ ور پیدا

جو قوم اپنے محسنین کو بھلا دیتی ہے، اس قوم میں محسنین آنا بند ہو جاتے ہیں۔ (غلام احمد پرویز)

مگر میری رائے میں ''جب کوئی قوم اپنے محسنین کے کیریکٹر پر تنقید شروع کر دیتی ہے تو وہ قوم خود نفسیاتی الجھاؤ میں الجھ جاتی ہے اور اس قوم کا اپنا کیریکٹر بتدریج مسخ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔''

ہاں جناح ایک سیکولر انسان ''تھا''، ہاں جناح ایک نیشنلسٹ ''تھا'' لیکن یہ یاد رہے کہ ہر انسان میں ایک ارتقاء کا پہلو موجود ہوتا ہے اور اسکی نمود بتدریج ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ وہی جناح تھا جس کے نام پر جناح کانگریس ہال آج بھی موجود ہے۔ یہ وہی جناح تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کیلئے انگریز سے جنگ شروع کی۔ یہ وہی جناح تھا جو اپنی خودی کی نمود اپنی ذات کی پختگی سے کر چکا تھا۔ ''جو کہتا تھا وہ کرتا تھا''۔ یاد رہے قرآن میں ہے کہ وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2)

اصول پرست انسان کو عموماً ہمارے جیسے معاشرے میں ضدی تصور کر لیا جاتا ہے یاد رہے کہ جناح ایک اعلیٰ درجہ کا قانون دان تھا اور قرآن ایک قانونی ضابطہ حیات ہے اور قرآن کو ایک قانونی ضابطہ حیات کی طرح سمجھنے کا شرف اللہ تعالیٰ نے محمد اقبال کو عطا کیا۔

یاد رہے کہ اقبال بھی ایک نیشنلسٹ ''تھا''۔ مگر پھر اسی نے کہا۔۔۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال ہی وہ شخص تھا جس نے قرآنِ کریم سے دو قومی نظریہ کے تصور کو اخذ کیا۔ یہی تصور حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر

حضرت محمد ﷺ تک ہر پیغمبر نے پیش کیا۔ یہ کوئی اقبال یا جناح کی اپنی ذہنی پیداوار نہیں تھی۔ یہ اسلام کا تقاضا ہے۔

پھر یاد رہے کہ اقبال بھی ایک قانون دان تھا اور ایک معلم کی حیثیت سے انہوں نے جناح کو قرآن سے ایک قانون کی کتاب کی حیثیت سے آشنا کرایا۔ ایک قانون دان کی حیثیت سے جناح خدا کے قوانین کو بہت جلد سمجھ گئے۔

جناح اقبال سے ملتے رہے اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اس عمل میں اقبال کو تین سے پانچ سال کا عرصہ لگا جبکہ ھیکٹر بولیتھو اپنی کتاب (Jinnah, Creator of Pakistan) میں ان کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک دہائی کا عرصہ بتاتا ہے۔

یاد رہے یہ اقبال ہی تھا جس نے قرآن کو بحیثیت دین کے امت سے آشنا کرایا۔ ہم چودہ سو سال سے اسلام کو مذہب ہی سمجھتے رہے۔ حقیقتاً اسلام ایک دین یا سسٹم ہے اور ہر سسٹم کو نافذ کرنے کے لئے ایک قانونی ضابطہ حیات یا کونسٹیچیوشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کونسٹیچیوشن کو نافذ کرنے کیلئے ایک خطۂ زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قرآن تمام انسانیت کے لیے ضابطہ حیات ہے۔

اقبال کی ساری تعلیم کا حاصل قرآن ہی کی تعلیم کو اُبھار اور نکھار کر اُمت کے سامنے لانا ہے۔ اور انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرانا ہے۔

ہم آج تک اقبال اور جناح کو سمجھ نہ سکے۔ کوئی انہیں مذہبی اور کوئی انہیں سیکیولر قرار دیتا ہے۔ حقیقتاً یہ دونوں الفاظ ان کی ذات کو زیبا نہیں ہیں۔

وہ دونوں قانون دان تھے اور خدا کے قوانین کو بہت اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اور جب کوئی خدا کے قوانین کو سمجھ لیتا ہے تو اس پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ ان قوانین کو انسانیت کی بھلائی کے لیئے اس دنیا میں کسی ایسے خطے پر نافذ کرے جہاں پہلے سے کوئی اور کونسٹیچیوشن نہ ہو۔ اس کے لئے ایک خطہ ارض کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اقبال نے یہ عظیم فریضہ جناح کے ذمہ لگا دیا۔ کیونکہ اقبال ساری عمر جس مردِ مومن کی تلاش میں رہا وہ اسے جناح میں نظر آیا۔ وہ پختہ ذات، وہ خودی کا علمبردار اور اقبال کی اُمیدوں کا پاسدار ''جناح'' وہ دونوں ایک عظیم مشن کی ابتدا کر کے چلے گئے۔ یہی مشن خدا نے حضراتِ موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے ذمہ لگایا تھا۔ ایسے رہبر اور لیڈر انسانیت کو بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ اقبال جناح کا ایک ادنیٰ سپاہی اور جناح اقبال کا ایک ادنیٰ سپاہی، ان دونوں کی زبانی:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زکوٰۃ کی مذہبی تعبیر اور اس کی دینی حقیقت

دنیا کی عام حکومتوں میں عوام ایک ادارہ ہوتے ہیں اور حکومت (عوام کی نمائندگی کی دعویدار) دوسرا ادارہ ہوتا ہے اگر کوئی غیر قوم حاکم ہوتی ہے تو یہ بات زیادہ واضح ہوتی ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں جب انگریزوں کی حکومت تھی تو یہ بات از خود واضح تھی۔ انگریزوں کا مقصد صرف یہاں کی ساری دولت سمیٹ کر انگلستان لے جا کر اپنی قوم پر صرف کرنا تھا۔ ان کی حکومت میں سالانہ بجٹ تک Discuss نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ خطۂ زمین آزاد ہوا تو یہاں کے حکمرانوں کے مفادات، عوام کے مفادات سے مختلف ہی ہوتے تھے، دولت لوٹنا، حکومت کرنے کے جذبے کی تسکین کرنا۔ ایک مرتبہ اگر اقتدار مل گیا، تو اس سے ایسا چمٹنا کہ چاہے جو کچھ ہو اقتدار نہیں چھوڑتے تھے۔ حکومت اور عوام دو ادارے ہوتے تھے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں، حکومت اور اُمت، دو الگ الگ ادارے نہیں ہوتے۔ اقتدار ساری اُمت کو ملتا ہے (24:55)۔ ساری اُمت حکومت میں شریک ہوتی ہے۔ البتہ اُمت معاشرہ کو منظم اور مربوط رکھنے کے لئے ایک ڈھانچہ، ایک مشینری بنا لیتی ہے، وہ اُمت کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔ اُسے حکومت کہتے ہیں۔

> اللہ سبحانہٗ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ ربوبیتِ عالمین وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے حصول کے لئے مملکت اور اُمت مل کر کوشش کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ، السلام والمؤمن ہے۔ ساری دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنا مملکت اور اُمت کی مشترکہ ذمہ داری ہے اس لئے امن وسلامتی قائم کرنا عبادتِ خداوندی ہے۔

جب یہ کہا جائے کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ مومنین زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اسلامی مملکت اور اُمت مسلمہ کا مقصدِ حیات اور مطمحِ نگاہ ایک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے جو عدے کئے ہیں ان وعدوں کو پورا کرنا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے اور اُمت اس کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان وعدوں کو پورا کرنا ہی عبادتِ خداوندی ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت مقاصد عالی حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان اعلیٰ مقاصد میں سے ایک مقصد صفاتِ خداوندی کو معاشرہ میں عملاً جاری کرنا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ ربوبیتِ عالمین وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے حصول کے لئے مملکت اور اُمت مل کر کوشش کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ، السلام والمؤمن ہے۔ ساری دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنا مملکت اور اُمت کی مشترکہ ذمہ داری ہے اس لئے امن وسلامتی قائم کرنا عبادتِ خداوندی ہے۔ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں، پرستش

مذہب میں ہوتی ہے جو مولوی پنڈت، پادری صاحبان کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کو، زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی کوشش کرنا، حکومت و اُمت کا مشترکہ مقصد ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے مملکت کا قائم کرنا اس لئے لازمی ضروری ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جن کی قرآن نے نشاندہی کی ہے ان کو عملی پیکروں میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان بلند مقاصد کی نشاندہی مستقل اقدار کی صورت میں بھی کی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ زندگی میں سرفرازی، سربلندی حاصل کرنے کا راز نے ان پر ہی عمل کرنا ہے اس تمام جدوجہد کا نتیجہ، انسانی ذات کی نشوونما کرنا ہوتا ہے۔ جو مملکت اور اُمت کا آخری نصب العین، اور منتہیٰ ہوتا ہے۔

> جب ایک فرد عدل کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر اپنی ذات میں استحکام پیدا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس مستقل قدر پر عمل کرنے سے معاشرہ از خود بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے ہر مستقل قدر کی یہی کیفیت ہے۔ یہ استحکام ذات کے ساتھ ساتھ استحکامِ نظام بھی کرتی ہے۔

ہم نے اپنے بیشتر مضامین میں مستقل اقدار کی وضاحت کی ہے لہٰذا اس مضمون میں ان کی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام پر ہم صرف ان مستقل اقدار کا عنوان تحریر کر کے، پھر اُن پر عمل کرنے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کی نشاندہی پیشِ خدمت عالی کی جائے گی۔

1۔ احترامِ انسانیت و تکریمِ بشریت

2۔ عدل کرنا

3۔ قانون کی اطاعت خود کرنا، اور دوسروں سے اس کی اطاعت کرانا

4۔ مشاورتی نظامِ حکومت

5۔ مملکت اور اُمت پر رزق کی ذمہ داری

6۔ زائد از ضرورت دولت دوسروں پر صرف کرنا

7۔ امورِ مملکت اہل لوگوں کے سپرد کرنا

8۔ مکافاتِ عمل پر ایمان

9۔ خود بھی قانون پر چلنا دوسروں کو بھی چلانا

10۔ احسان

11۔ کوئی کسی کا غلام و محکوم نہیں

12۔ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود ادا کرے

13۔ جرم کی، جرم کے مطابق سزا

14۔ تعین مدارج اور ذات پات کی تردید و مذمت

15۔ وحدت نوع انسانی

مستقل اقدار صرف وحیٔ خداوندی دے سکتی ہے۔ عقلِ انسانی ان کو وضع نہیں کر سکتی۔ اسلامی مملکت اور افرادِ اُمت دونوں کی زندگی کا مقصد انسانی ذات کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ اُمت کا ہر فرد ان مستقل اقدار پر اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اس کا تزکیۂ نفس ہو۔ لیکن ان مستقل اقدار میں سے ہر قدر، مملکت کو بھی مستحکم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک فرد عدل کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر اپنی ذات میں استحکام پیدا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس مستقل قدر پر عمل کرنے سے معاشرہ ازخود بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے ہر مستقل قدر کی یہی کیفیت ہے۔ یہ استحکام ذات کے ساتھ ساتھ استحکامِ نظام بھی کرتی ہے۔ اس طرح حکومت اور اُمت مسلمہ ایک ہی ادارہ ہوتے ہیں۔

عقل انسانی آج تک خیر و شر کا تعین نہیں کر سکی اور نہ ہی خیر و شر Good and Evil کر سکی ہے اور قرآن کا چیلنج بھی یہ ہے کہ عقل انسانی Good اور Evil کو متعین نہیں کر سکتی (2:216) قرآن کا یہ چیلنج بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

(1) مستقل اقدار خیر و شر کو متعین کر دیتی ہیں۔

(2) ان اقدار کا ساری انسانیت پر اطلاق ہوتا ہے۔

(3) یہ مستقل اقدار قیامت تک بھی Out-dated نہیں ہو سکتیں۔

(4) یہ اقدار حقوقِ انسانی کا تعین کرتی ہیں۔

(5) ان کے ذریعے رفاقتِ خداوندی حاصل ہوتی ہے۔

ان مستقل اقدار میں سے ایک قدر ایتائے زکوٰۃ بھی ہے جو بہت اہم قدر ہے۔ قرآنِ کریم کی اہم ترین اقدار اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنی ان دونوں اصطلاحوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ بڑا ہی جامع ہے۔ ان اصطلاحوں کی جامعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جامع اصطلاحات وحی ہی وضع کر سکتی ہے ان کو وضع کرنا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں ہے مذہب نے ان دونوں اصطلاحوں کو نہ سمجھا نہ ان پر عمل کیا اور نہ ہی ان اصطلاحوں کی اہمیت اور مرتبہ مذہب کے سامنے آیا۔ ہم اس مضمون میں ایتائے زکوٰۃ کی اصطلاح پر گفتگو کریں گے۔ پہلے اس کی مذہبی تعبیر پھر اس کی قرآنی حقیقت پیشِ خدمتِ عالی کی جائے گی۔

سورۂ توبہ میں ارشادِ عالی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (9:34)

ترجمہ: اے ایمان والوں اس میں شک نہیں کہ بہتیرے عالم اور زاہد لوگوں کے مال ناحق کھا لیتے ہیں اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسولؐ) ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں ابنِ کثیر میں ہے ''مسند احمد میں ہے کہ سونے چاندی کی مذمت کی یہ آیت جب اُتری۔ صحابہؓ نے آپس میں چرچا کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا تو میں حضور ﷺ سے دریافت کر آتا ہوں۔ اپنی سواری تیز کر کے رسول اللہ ﷺ سے جا ملے اور روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے کہا پھر ہم اپنی اولادوں کے لئے کیا چھوڑ جائیں گے۔ اسی میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے پیچھے پیچھے حضرت ثوبانؓ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے سوال پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی کئے مقرر فرمائی کہ بعد کا مال پاک ہو جائے۔ میراث کے مقرر کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کے خوشی سے تکبیریں کہنے لگے۔ (جلد دوم، صفحہ: 306)

لَا يُنْفِقُوْنَهَا کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ اس آیت میں یہ مبارک الفاظ اس درجہ واضح ہیں کہ ان میں غلط مفہوم لینے کی گنجائش نہیں رہتی۔ تمام مترجمین و مفسرین نے ان کا ترجمہ ''اور اس کو خرچ نہیں کرتے'' کیا ہے۔ هَا کی ضمیر تمام ''اموال الناس'' لوگوں کے اموال کی طرف راجع کی ہے۔ حکم سارے اموال کے خرچ کرنے کا ہے۔ لیکن ہمارے مفسرین خرچ کے لئے اس مال کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں

مشہور و مستند تفسیر تفسیر مظہری میں اس آیت کے ذیل میں تحریر فرمایا ''بُغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے۔ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں کو یہ حکم بڑا شاق گزرا۔ انہوں نے کہا ایسا کون کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ چھوڑے۔ اس کا تذکرہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے زکوٰۃ اسی لئے تو فرض کی ہے کہ تمہارا باقی مال پاک ہو جائے۔

اکثر مفسرین نے، اور خصوصاً مولانا اصلاحی نے، ''تدبرِ قرآن'' میں اس آیت میں احبار و رُھبان کو اہلِ کتاب کے احبار و رُھبان قرار دیا ہے اور مسلمان علماء مشائخ کو اس جرم سے بری الذمہ قرار دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ لیکن مشہور تفسیر ضیاء القرآن نے کتمان حق نہیں کیا انہوں نے تحریر فرمایا کہ اس آیت کا اطلاق مسلمان احبار و رُھبان پر بھی ہوتا ہے اور انہوں نے اس کے لئے بڑی مضبوط دلیل تحریر کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔ ''اگرچہ بعض علماء نے اس آیت کو بھی اہلِ کتاب سے مخصوص کیا ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ اس میں اہلِ کتاب اور مسلمان سب داخل ہیں۔ جس میں یہ خرابی ہوگی وہ اس سزا کا مستحق ہوگا۔ کیونکہ اگر صرف اہلِ کتاب مراد ہوتے تو الذین کا اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔ (جلد دوم، صفحہ: 200) حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل ناقابلِ تردید ہے یہ اپنی جگہ بڑی مضبوط دلیل ہے ورنہ اکثر مفسرین نے عمداً، جان بوجھ کر اس آیت کو صرف

اہلِ کتاب کے احبار ورُھبان تک محدود کر کے، اپنے علماء کو اس جرم سے بچانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس آیت میں جو سب سے اہم توجہ طلب بات ہے وہ لَا يُنْفِقُوْنَهَا کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ اس آیت میں یہ مبارک الفاظ اس درجہ واضح ہیں کہ ان میں غلط مفہوم لینے کی گنجائش نہیں رہتی۔ تمام مترجمین ومفسرین نے ان کا ترجمہ ''اور اس کو خرچ نہیں کرتے'' کیا ہے۔ هَا کی ضمیر تمام ''اموال الناس'' لوگوں کے اموال کی طرف راجع کی ہے۔ حکم سارے اموال کے خرچ کرنے کا ہے۔ لیکن ہمارے مفسرین خرچ کے لئے اس مال کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ وہ مال کا ایک حصہ خرچ نہیں کرتے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر ہمارے علماء کے عقیدہ کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے وہ نصاب کہتے ہیں۔ نصاب جس نسبت سے مقرر کیا گیا ہے اسے شرح کہا جاتا ہے ہمارا جو آج کل کا موجودہ نصاب وشرح ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ چاندی۔۔۔ساڑھے باون تولے

2۔سونا۔۔۔ساڑھے سات تولے

3۔اونٹ۔۔۔5عدد

4۔گائے۔۔۔30عدد

5۔بکریاں۔۔۔40عدد

اس نصاب کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس نصاب کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے دور مبارک میں ان تمام اشیاء کی قیمت ایک ہوگی لیکن موجودہ زمانہ میں ان اشیاء کی قیمت ایک نہیں ہے۔ اس لئے یہ نصاب آج کل جاری نہیں ہوسکتا۔

قرآنِ کریم نے زکوٰۃ کے مصارف بیان نہیں کئے۔ ہمارے علماء زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کرتے ہیں وہ صدقات کے ہیں۔ وہ زکوٰۃ کے نہیں ہیں۔ اس آیت میں لفظ ہی صدقات کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسلامی نظام چونکہ اللہ تعالیٰ کے Behalf پر قائم کیا جاتا ہے اس لئے وہ اللہ کے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نظام کی اطاعت فرض ہوتی ہے اگر یہ نظام اللہ کے وعدے پورے نہیں کرتا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اس بستی سے اس نظام کی اطاعت مرفوع ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ دوسرے مقام پر متعین طور پر انسانوں کے لئے فرمایا: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151) ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتے ہیں۔ اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جو اللہ نے اپنے ذمہ لی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ہی یہ نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا نظام قائم ہوتا ہے کہ جس سے تمام افراد انسانیہ کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اس حقیقت کو سورۂ حج میں قرآن نے بیان کیا اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:40) یہ مومنین وہ ہیں کہ اگر اُنہیں زمین میں اقتدار مل

جائے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ یعنی نوع انسان کو سامانِ نشوونما دیں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ولازمی ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اسلامی حکومت کی ساری آمدنی، زکوٰۃ یعنی نشوونما کے ذرائع کہی جاتی ہے۔ اس آمدنی میں نہ کوئی خاص نصاب ہوتا ہے اور نہ ہی غیر متبدل شرح، حکومت اس کو حالات کے مطابق مقرر کرتی ہے۔ قرآنی مملکت جو بھی Revenues جمع کرتی ہے اور پھر اس پورے Revenues کو اپنی آبادی پر خرچ کرتی ہے۔ ان تمام رقوم وواجبات پر زکوٰۃ کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس میں جسمانی نشوونما بھی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما بھی اسی میں شامل ہوتی ہے۔

سورۃ احزاب میں رسول اللہ کی ازواج کو دیگر ہدایات دینے کے بعد ارشادِ عالی ہے:

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ط (33:33)

تم نظامِ صلوٰۃ قائم کرو، اور اُمت کے لوگوں کی جو تمہارے لئے مثل تمہارے بیٹوں کے ہیں، ان کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی کرتی رہو۔ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں زکوٰۃ کا وہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا جو مفہوم ہمارے ہاں آج کل مروج ہے۔ کیونکہ ازواج رسول کے پاس تو سال بھر میں اتنی دولت جمع نہیں ہوتی تھی جو نصاب کی حدود میں داخل ہوں۔ سورۃ الحج میں فرمایا کہ اگر ہم مومنین کو اقتدار دیتے ہیں تو وہ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اس سے اگلے ہی سورہ المومنون میں ارشاد عالی ہے کہ وہ مومنین ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (23:4) وہ ہر وقت زکوٰۃ کا کام کرتے رہتے ہیں یعنی تمام وقت نوعِ انسانی کی نشوونما کرتے رہتے ہیں۔ ان کے تمام اعمال زکوٰۃ کے لئے ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا مقصود ہی ساری انسانیت کو زکوٰۃ پہچانا ہے۔ جو عام حکومتیں ہوتی ہیں ان میں ان کے لیڈروں کا مقصد صرف لوٹ مار کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت کا مقصود ساری انسانیت کی نشوونما کرنا ہوتا ہے۔ جو مملکت اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے دو ستون پر قائم ہوتی ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس مملکت میں امن وامان ہوگا اور اس میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ (2:277)

وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے، یعنی نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ساری انسانیت کی پرورش کرتے جاتے ہیں یہ وہ لوگ ہے جن کا بدلہ خدا کے ہاں ہے اس اجر کی بھی وضاحت فرما دی۔ کہ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:277) یہ ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں خوف وحزن باقی نہیں رہتا۔

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا Pregmatic Test یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جس نظام میں خوف وحزن باقی نہیں رہتا۔ ہمارے نظام میں ان دونوں ارکان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے نظام میں خوف وحزن موجود ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری صلوٰۃ اور زکوٰۃ وہ صلوٰۃ وزکوٰۃ نہیں ہیں جو

قرآن کو مطلوب ہیں۔ یہ ایک مضبوط دلیل ہے۔ لیکن ہمارے مفسرین بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے کو اس Test سے نکال لیا اور یہ تاویل کی کہ یہ خوف وحزن مرنے کے بعد نہیں ہوگا۔ چونکہ مذہب میں سب کاموں کے نتائج مرنے کے بعد برآمد ہوتے ہیں، اس لئے مذہب کے کسی عقیدہ کے نتائج کا ٹیسٹ نہیں ہوسکتا کہ یہ عقیدہ یا کام درست ہے یا غلط۔ دین میں کاموں کے نتائج اس دنیا میں برآمد ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ان کا Test یہاں ہی کیا جاسکتا ہے۔

زیرِ غور آیۂ کریمہ سورۂ البقرہ کی آیت نمبر 277 ہے اس سے پیشتر آیت نمبر 270 سے آیت نمبر 280 تک دس آیات کریمات میں ربوٰ کے متعلق احکامات آرہے ہیں جو سارے اس دنیا سے متعلق ہیں۔ ربوٰ پر عمل کرنے کے نتائج بھی اس دنیا ہی میں برآمد ہوں گے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس درمیانی آیت کے نتائج بھی اسی دنیا میں برآمد ہوں۔ لیکن ہمارے مفسرین اس آیت میں جو صلوٰۃ وزکوٰۃ کے نتائج برآمد ہوتے ہیں، ان کو آخرت پر ملتوی کر دیتے ہیں۔

مذہب کے برخلاف دین میں تمام اعمال کے نتائج اسی دنیا میں برآمد ہوجاتے ہیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ دین کا دعویٰ درست ہے یا غلط سورۃ النور میں ارشاد عالی ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ (24:53)

اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، بہت تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو یہ سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں گے۔ تم ان سے کہو قسمیں نہ کھاؤ۔ اطاعت کرو۔ اطاعت معروف ہوتی ہے۔ یہ ہے قرآن کا دعویٰ مذہب میں اطاعت کے نتائج آخرت میں آتے ہیں اس لئے کسی بات کے لئے فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ مذہب صحیح بات کہہ رہا ہے یا غلط۔ وہ ہر عمل کے ثواب کو اس کا نتیجہ قرار دے دیتا ہے لیکن ثواب نہ تو دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی معروف ہوتا ہے۔ وہ معروف میں شامل ہی نہیں لیکن دین میں اطاعت کا نتیجہ معروف ہوتا ہے۔ دین میں اطاعت ایسی ہوتی ہے جو جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اطاعت کو اپنے تعارف کے لئے کسی قسم (سوگند) کی ضرورت نہیں ہوتی وہ سامنے دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ معلوم ہو رہا ہوتا ہے کہ اطاعت ہو رہی ہے۔ عمل محسوس اپنا تعارف خود کرا دیتا ہے۔ اس آیت سے اگلی آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کرو (24:54) اور اس سے ملی ہوئی اگلی آیۂ کریمہ (24:55) میں اللہ ورسول کی اطاعت کا محسوس نتیجہ استخلاف فی الارض سامنے آجاتا ہے اور اس طرح اطاعت معروف بن کر سامنے آکھڑی ہوگئی۔ یہ ہے اطاعت کا معروف ہونا طاعۃ معروفۃ۔ اطاعت کے نتیجہ کی محسوس شکل ضروری ہے جیسا کہ استخلاف فی الارض کی شکل میں سامنے آئی۔

تم ان سے کہو قسمیں نہ کھاؤ۔ اطاعت کرو۔ اطاعت معروف ہوتی ہے۔ یہ ہے قرآن کا دعویٰ مذہب میں اطاعت کے نتائج آخرت میں آتے ہیں اس لئے کسی بات کے لئے فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ مذہب صحیح بات کہہ رہا ہے یا غلط۔

امجد محمود، راولپنڈی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گُلِ گلاب

(محمد اکرم راٹھور صاحب کی وفات کو ایک سال بھی ہوگیا۔ یہ تحریر محترم امجد محمود صاحب نے محمد اکرم راٹھور صاحب کی وفات کے فوراً بعد ارسال کی تھی لیکن بوجوہ شامل اشاعت نہ ہوسکی۔ اب یہ شائع کی جارہی ہے۔ مدیر)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے انسانوں کے لئے بے شمار قسم کے پھول پیدا کئے ہیں۔ ہر پھول دوسرے پھولوں سے مختلف اور جُداگانہ رنگ رُوپ اور بناوٹ کا آئینہ دار ہوتا ہے کچھ پھولوں کی پتیاں قدرے چھوٹی اور کچھ کی نسبتاً بڑی بڑی ہوتی ہیں کچھ بڑے ہی نرم و نازک اور ملائم ہوتے ہیں جبکہ کچھ دوسروں کی نسبت بڑے کُھردرے اور خاردار کوئی تو زمین پر اُگتے ہیں اور کوئی تالالوں، جوہروں اور ندی نالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ کے تنے بڑے دراز قد اور شاخیں بڑی لمبی اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور کچھ کے تنے پست قد اور چھوٹے جبکہ شاخیں اُن کی ذرا محدود پھیلاؤ کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں پیدا ہونے والے پھول سرعت کے ساتھ مرجھا جانے والے بھی ہوتے ہیں اور کئی ایسے کہ اُن پر زوال ذرا دیر سے آتا ہے اور اس طرح وہ اپنی رعنائی اور خوبصورتی دیر تک بحال رکھتے ہیں۔

خوشبوؤں کی طرف آئیں تو ایسے پھول بھی ملیں گے کہ اُن میں خوشبو نام کی نہیں ہوتی اور اگر ہو تو بہت کم کم، محسوس کرنے کے لئے بہت قریب ہوکر سونگھنے سے معلوم پڑتا ہے کہ اُن میں کچھ برائے نام سی مہک ہے یعنی تردد کرنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اُن میں کچھ خوشبو ہے اور اگر ناک کسی کا سولہ آنے کام نہ کر رہا ہو تو وہ اُس سے محروم ہی رہتا ہے یعنی یہ کیا ہے کہ ایک پھول ہے خوبصورتی بھی ہے، جاذب نظر بھی ہے۔ دلکش بھی ہے لیکن اُس پھول میں خوشبو نہیں، اور اگر ہے بھی تو اتنی کم کہ اپنے ہونے کا احساس ہی نہ دلا سکے، اپنے کسی طالب کے ذوق تسکین کا سامان نہ کرسکے۔ اپنے ہونے کا اعلان کرنا تو ایک طرف اپنے وجود کے ہونے کا جواز بھی فراہم نہ کرسکے۔ کوئی قریب سے گزر جائے اور وہ اپنے زوردروں سے اس کے قدموں کی آہٹ کو محسوس کرکے بھی اُس کو

متوجہ نہ کر پائے۔ ایسے پھول اپنا وجود تو رکھتے ہیں لیکن اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی خوشبو سے معطر نہیں کر سکتے۔ لیکن خداوند کریم نے اپنے پیدا شدہ لاتعداد پھولوں کی اقسام میں ایسے پھول بھی پیدا فرمائے ہیں کہ اُن کا وجود اپنے ہونے کا اعلان کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی۔۔۔ پھولوں کی اس وسیع وعریض برادری میں بے شمار اقسام کے پھول ملتے ہیں۔ جن میں مختلف قسم کی خوشبوئیں پائی جاتی ہیں ان میں کی ایک قسم گل گلاب بھی ہے جو اپنے رنگوں کے حوالے سے اپنی خوبصورتی کے حوالے سے اپنی بناوٹ کے حوالے سے اور ان سب خصوصیات سے بڑھ کر اپنی خوش بُو کے حوالے سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ جس کے آنگن میں یہ کھلا ہو اُس کے آنگن کے چہار اطراف میں اپنی خوشبوئیں پھیلا دیتا ہے۔ یہ وہ پھول ہے کہ جس کی خوشبو کو سونگھنے کے لئے کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ خداوند کریم نے تحریکِ طلوعِ اسلام کے آنگن میں بھی ایسا گلِ گلاب کھلایا تھا۔ وہ کھلا وہ بڑھا۔ پھولا پھلا اور اُس نے اپنی خوشبوؤں کو آس پاس کے چاروں اطراف بکھیر دیا۔ جتنا عرصہ زندگی کا تحریک میں گزارا اپنی خوشبوؤں سے گردونواح کو متاثر کرتا رہا۔ جو کوئی اُس سے ملتا اُس کی بے پناہ خوشبو کو اپنے اندر جذب کر کے اُٹھتا۔ مسکراتا چہرہ، تبسم سے لبریز انداز گفتگو، شخصیت ایسی کہ جو قریب جاتا دوبارہ ملنے کو ترستا، سادہ طرزِ زندگی کا نشان، اپنے اندر مقصدِ زندگی کو حاصل کرنے کی بے پناہ تمنا۔ یہ گل گلاب اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہمیں یہ سبق سکھاتا ہوا کہ خوشبوئیں کیسے بکھیری جاتی ہیں اس کرۂ ارض پر اپنی زندگی کی سانسیں پوری کرتے ہوئے اس جہاں سے اُس جہاں کی جانب منتقل ہو گیا۔ زندگی جوئے رواں است رواں خواہد بود۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کے گلِ گلاب محترم اکرم راٹھور صاحب کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

اک عجب درویش تھا کہ جو گزر گیا۔

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بُکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین

فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے

علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔



فون نمبر:
0322-6386991

حکیم عبدالمجید

ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ باتیں نوجوانوں سے

طلوع اسلام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن مجید کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے، خاص طور پر نوجوانوں کو قرآن کے اصول وقوانین سے آگاہ کیا جائے۔ قرآن پڑھنا سمجھنا اور پھر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، جو لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں ان کو قرآن سمجھانا ہر پڑھے لکھے مسلمان پر فرض ہے۔

(دیکھئے القصص: 87-85، ق: 45، المائدہ: 67)

ہمارے قارئین یہ پوچھتے رہتے ہیں جن میں نوجوان طالب علموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے کہ ہم کیا کریں؟ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ طلوع اسلام کی وجہ سے قرآن کی تعلیمات سے تو ہم فیض یاب ہو ہی رہے ہیں، قرآن کا نظام ربوبیت بھی ہم سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنی عملی زندگی میں ان کا نفاذ کیسے کریں؟ یہ وہ سوال ہے جو طلوع اسلام پڑھنے والے اکثر نوجوان ہمیشہ سے سوچتے اور پوچھتے چلے آرہے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن کریم کے اصول وقوانین کو کس طرح نافذ کریں؟

کچھ نہ کچھ کرنے کی آرزو عام طور پر ہر باشعور انسان کے دل میں ضرور ہوتی ہے، جب کوئی نوجوان مسلمان قرآن پڑھتا اور سمجھنے لگتا ہے تو اس کے دل میں کچھ اچھا کر گزرنے کی خواہش زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن کی روشنی میں اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے کیا اور کیسے کرے؟ قرآن کریم کی ہدایات میں سے ہم اپنے نوجوانوں کو چند ضروری باتیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآنی تعلیمات پر انفرادی اور اجتماعی طور پر عمل کرنا آسان کام نہیں ہے، قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں ہمیں اس طرح سمجھائی گئی ہے کہ: (مفہوم)

وحی کی راہ نمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے، لیکن چونکہ اِس سے اِنفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے، اِس لیے وہ اِس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اِس جنتی معاشرہ کے قائم کرنے کے لیے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سو، اے جماعتِ مومنین! تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اِس معاشرہ کو یونہی قائم کرلو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی اُن جاں گداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اِس سے پہلے اِس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ اُن کی شدت

سے اُن کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اوران کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالٰہا! ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر اُن کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور تائید ایزدی اُن کی سعی وعمل کو ثمر بار کرتی۔ تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا۔ (البقرہ:214)

یہی بات دوسری جگہ سورہ البقرہ : 157-155 میں اس طرح سمجھائی جارہی ہے:

اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں تمہیں اِس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ تمہاری صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ (ٹکراؤ کے بغیر انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔ مزید دیکھئے، الملک:2) اس میں کہیں جنگ وقتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا تو کبھی کھانے پینے کے سامان کی کمی ہوگی۔ کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن آخرالامر فتح وکامرانی کی خوش خبریاں ان کے لیے ہوں گی جو اِس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب ومشکلات کے ہجوم میں اُن کی نگاہیں، اِس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی نظامِ خداوندی کا قیام بنے۔ ہم نے اپنے آپ کو اِس کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اِسی نصب العین کی طرف اٹھے گا وہی ہمارا مقصود ومنتہٰی ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحق ہزار تبریک وتہنیت ہے۔ انہیں اُس کے قانون کی تائید حاصل ہے انہی کے لیے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف واکرام کی بارشیں ہیں اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (البقرہ : 157-155)

قرآن کی روشن راہنمائی میں عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان بھی اسی طرح کا ہو جس طرح قرآن کریم میں بتایا گیا ہے۔ ہمارا ایمان کس طرح کا ہونا چاہیے اس کے لیے پڑھیے: (مفہوم)

ان (مخالفین) سے کہو کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون سا مسلک ہے جسے اختیار کر کے ہم تمہاری خود ساختہ گروہ بندی اور نسل پرستی سے بلند ہو چکے ہیں۔ وہ مسلک یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس ضابطہء حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو اُس نے (اِس رسول کے ذریعے) ہماری طرف بھیجا ہے۔ (یہ، اپنی اصل کے اعتبار سے اُسی قسم کا ضابطہء حیات ہے جس قسم کا اس سے پہلے) ابراہیم واسماعیل واسحٰق ویعقوب اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف نازل ہوا تھا۔ ہم اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں بھی (اپنے اپنے وقت میں) خدا کی طرف سے ضوابطِ حیات ملے تھے۔ نیز موسیٰ کو بھی اور عیسیٰ کو بھی۔ بلکہ تمام انبیاء کو۔ ہم ان تمام انبیاء کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھتے ہیں اور نبی ہونے کی جہت سے اُن میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی رو سے ہم خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ ہے ہماری دعوت۔ اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح اس ضابطہء حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو اُس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے اور اگر یہ اِس سے اعراض برتیں گے تو اُن کا یہ اعراض اُس راستے سے ہٹ جانے کے

مترادف ہوگا جس پر تمام انبیاءؑ سابقہ چلتے رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اِس راستے کو اختیار نہ کیا اور اپنی ضد پر قائم رہے، تو ان کی مخالفت بدستور رہے گی لیکن تمہیں اس کی قطعاً پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے نظام میں، جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت موجود ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اِس لیے کہ یہ اُس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ (البقرہ:136-137)

یہی بات اس طرح بھی سمجھائی گئی ہے:

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اللہ کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لیے باعث تقویت بنتی ہیں، الاحزاب:43) اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لیے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ دیکھیں مفہوم القرآن 41:30، (3:124-125، 8:10-12، 46:13)۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لیے تمہیں یہ جنتی زندگی اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے ہوگا جو مانگو گے ملے گا، یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔ اور یہ سب کچھ ایسی عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے اس میں اللہ کی طرف سے زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہوگا اور سامانِ نشوونما بھی۔ اس کے بعد بتاؤ کہ اس شخص کی بات سے زیادہ حسین اور جاذب بات اور کس کی ہوسکتی ہے جو لوگوں کو قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے اور (اس طرح اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیتا ہے کہ) وہ ان میں سے ہے جو مسلمین ہیں یعنی ان لوگوں میں سے ہے جو قوانین خداوندی کے اطاعت گزار ہیں۔ یاد رکھو! معاشرہ اور انسانی ذات میں حسن پیدا کرنے والے کام اور ایسے کام جن سے بگاڑ پیدا ہو نتیجہ کے اعتبار سے کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے (یعنی اچھے اور برے کام ایک جیسے نہیں ہو سکتے) اگر معاشرہ میں ناہمواریاں (یعنی خرابیاں) پیدا ہو جائیں تو ان کے ازالے کی بہترین صورت یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرنے والے کام کیے جائیں۔ (اس سے غلط کاموں کے مضر اثرات کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور آئندہ کے لیے بگاڑ بھی رک جائے گا۔ نیز اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ) وہ شخص جس کی طرف سے بگاڑ پیدا کرنے والی حرکت سرزد ہوئی تھی اس میں اور تم میں اگر سخت عداوت ہوگی تو وہ تمہارا گرمجوش دوست بن جائے گا۔ (برائی کو بھلائی سے روکنے کا یہ طریقہ ہے لیکن یہ طریق انہی کی صورت میں کارگر ہوسکتا ہے جن میں اصلاح کا امکان ہو۔ جو مخالفت کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوں ان کے علاج کے لیے سختی کی ضرورت پڑے گی)۔ لیکن یہ طریق کار ہے بڑا مشکل اور اس پر عمل پیرا وہی ہوسکتا ہے جو نہایت مستقل مزاج ہو،

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس شخص کو اس طریق کار کی توفیق نصیب ہو جائے تو وہ بڑی کامیابیوں اور کامرانیوں کا مالک ہوگا۔ یہ کام دشوار اس لیے ہے کہ سرکش قوتیں اور خود تمہارے سطحی مفاد پر مبنی جذبات اس کی کوشش کریں گے کہ تمہاری اس روش میں بگاڑ کی صورت پیدا کر دیں۔ ایسی صورت میں اس کا علاج یہ ہے کہ تم اور شدت سے قوانین خداوندی کی پیروی کرنے لگ جاؤ۔ اس سے تمہیں ان تخریبی عناصر کی فساد انگیزیوں سے پناہ مل جائے گی۔ یاد رکھو! اللہ ہر بات کا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (حٰمٓ السجدہ:36-30)

قرآن حکیم آسمانی دستور حیات ہے۔ دستور یا آئین Constitution کسی معاشرے پر لاگو کرنے کے لیے ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہوتا ہے اور ایسے بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کریم کو بطور آئین نافذ کرنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت دی:

ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا کہ سرِ دست مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کر دو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تم اپنی پارٹی کے لیے کوئی تربیتی مرکز بناؤ جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں اس لیے) تم فی الحال اپنی جماعت کے ممبروں کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کر دو اور اس طرح اس نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کر دو (جسے آخر الامر تمام معاشرہ کو محیط ہو جانا ہے) اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوش خبری دیتے رہو (تاکہ ان کی ہمتیں تازہ اور حوصلے بلند رہیں)۔

اوپر لکھی ہوئی آیت مبارکہ (یونس:87) جو ابھی آپ نے پڑھی ہے اس پر زیادہ توجہ دیجیے۔ قرآن کریم کی ہر آیت ہماری پوری پوری توجہ چاہتی ہے، اس آیت مبارکہ میں ہدایت دی جا رہی ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنا لو۔ ہمارے اور آپ کے گھر کسی بھی مملکت کے سب سے چھوٹے یونٹ ہوتے ہیں یعنی ایک ایک گھر سے مل کر ایک گلی اور پھر ایک محلہ اور پھر قصبے اور شہر بنتے ہیں، ہمارے گھر ہمارے ملک کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں Units ہیں جن سے مل کر گلی، محلے اور شہر بنتے ہیں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو قرآن کریم پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنالیں اور نظامِ صلوٰۃ قائم کریں۔ مزید غور فرمائیے کہ جس چیز کو ہم معاشرہ Society کہتے ہیں وہ ہمارے آپ کے کھلے ہوئے گھروں کا نام ہے۔ صبح سویرے ہم سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام دھندوں کے لئے دفتروں، کارخانوں، بازاروں اور تعلیمی اداروں وغیرہ کے لئے چل پڑتے ہیں۔ آپ یہ سوچئے کہ جس قسم کے کردار کے لوگ گھروں میں رہتے ہیں وہی کردار معاشرے میں ہوں گے، اگر گھروں میں نیک لوگ رہتے ہوں گے تو معاشرہ بھی اچھے انسانوں کا ہوگا۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ ہمارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے اور ہم اچھے اور اعلیٰ کردار کے انسان اور مسلمان بننا چاہتے ہیں جو کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں بہت ہی مشکل کام ہے تو اس کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو مرکزِ توجہ بنالو اور الصلوٰۃ قائم کرو۔ اگر آپ اپنے گھرانے کے سربراہ ہیں یا ذمہ دار فرد ہیں تو آپ کے

لئے آپ کا گھر ایک ایسی جگہ ہے جہاں آپ گویا بادشاہ اور مکمل طور پر خود مختار ہوتے ہیں جہاں آپ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی بھی نہیں ۔ یہ باتیں ہم ان نوجوانوں کو سمجھانے کے لیے لکھ رہے ہیں جن کی تمنا ہے کہ وہ قرآن کریم کی رہنمائی میں اپنے معاشرے کے لیے اچھے کام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمیں ایک حکم مختلف انداز سے بھی واضح کر کے فرمایا ہے۔ پہلے ہمیں ہدایت دی گئی کہ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بناؤ دوسرے مقام پر جو ہدایت دی جارہی ہے اس پر بھی توجہ فرمایئے:

(اے رسول!) تم ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی کوئی طول وطویل لیکچر دینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے لیے ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو! اگر تم نے ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا تو تمہیں نظر آجائے گا کہ یہ رسول (جو تمہیں دن رات اس قسم کی نصیحتیں کرتا رہتا ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کوئی پاگل نہیں (اس کی باتوں میں معاذ اللہ جنون Madness نہیں ہے)، اس کی ہر بات علم و بصیرت پر مبنی ہے اور اسی علم و بصیرت کی روشنی میں وہ تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے قبل از وقت متنبہ کر رہا ہے۔ (سبا:46)

یونس:87 میں ہدایت دی جارہی ہے کہ انفرادی طور پر ہم اپنے اپنے گھروں کو مرکزِ توجہ بنالیں اور صلوٰۃ قائم کریں جب کہ سبا:46 میں ہمیں کہا جارہا ہے کہ تم اللہ کے لیے ایک ایک اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر غور وفکر کرو۔ اس بات پر بھی غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ جیسی عظیم ترین ہستی، اتنی بڑی کائنات کا مالک ہم فانی انسانوں کو جو کہ آج کے دور میں اربوں کی تعداد میں ہیں ان میں سے ایک ایک فرد کو یہ حکم اور ہدایت دے رہا ہے کہ تم (سب کے سب اگر نہ سہی تو) اللہ کے لئے اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں علم وبصیرت پر مبنی ہیں۔)

یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کریم کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے ہمارے کردار میں صبر واستقامت کے ساتھ عزم وہمت کا ہونا بہت ضروری ہے، عزم وہمت کے ساتھ ہی ہم انفرادی طور پر اور پھر اجتماعی طور قرآن پر عمل کر سکیں گے، مثلاً:

لقمان نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ تم نظام صلوٰۃ کو قائم کرو جس بات کو وحی خداوندی جائز قرار دے اس کا حکم دو۔ جسے وہ معیوب کہے اس سے لوگوں کو روکو۔ اس نظام کے قیام اور بقا کی جدوجہد میں تمہیں جو مشکلات بھی پیش آئیں ان میں ہمیشہ ثابت قدم رہو۔ یاد رکھو! مصائب اور مشکلات میں ثابت قدم رہنا (عزم الامور یعنی) ہمت کے کام ہیں اور اس کے لیے بڑے مستحکم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (لقمان:17)

یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہر اس شخص کے لئے اسوہء حسنہ Model Character ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کی نتیجہ خیزی پر یقین کامل رکھتا ہو (الاحزاب:21) دین خداوندی کے مقابلے میں

رشتہ داری کے تعلقات کی حیثیت کیا رہ جایا کرتی ہے اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقا کے طرزِ عمل کو بہترین نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے (الممتحنہ 7-4)

جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور حسین ترین مضبوط کردار کی بات کرتے ہیں تو ان کے کردار کی بہت ساری خصوصیات میں سے دو عظیم اور اہم ترین خوبیاں تھیں صداقت اور امانت، نبوت سے قبل ہی ان کو اپنے اور بیگانے سب صادق اور امین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی سچ بات کہنے کا حکم دیا ہے، نہ صرف سچ اور حق بات کہنے کا حکم دیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ صاف اور سیدھی بات کیا کرو خاص طور پر جب کسی معاملے میں تمہاری گواہی Witness کی ضرورت پڑے تو تم اللہ کی طرف سے گواہ بن کر شہادت دو، توڑ مروڑ کر اور پیچ دار بات نہ کیا کرو، صاف اور سیدھے لفظوں میں ہر حال میں سچ کہنا ہے یہاں تک کہ تمہارا سچ تمہارے اپنے، تمہارے والدین کے اور اقربین کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ دیکھئے الاحزاب:71-70 اور النساء:135

قرآنی آیات کی روشنی میں جو باتیں ہم نوجوانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں کہ:

1۔ زندگی کے ہر موڑ اور ہر معاملے میں صادق اور امین بننا ہوگا۔

2۔ بات صاف اور سیدھی کیا کرو۔

3۔ اللہ کے لیے اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا۔

4۔ اپنے اپنے گھروں کو اپنا مرکزِ توجہ بنانا ہوگا۔

5۔ قرآن کے احکام پر عمل ہم چاہے انفرادی طور پر کریں یا اجتماعی طور پر قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا ہوگا جس کے لئے صبر و استقامت، عزم و ہمت کے ساتھ تحمل اور برداشت کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔

کسی بھی بگڑے ہوئے معاشرے میں قرآن کی راہنمائی میں مومنوں والی زندگی گزارنا آسان کام نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور ان کے عظیم کردار میں ہمارے دکھوں کا مداوا اور مسائل کا حل موجود ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں سے یہ کہیں گے کہ اس مضمون کی روشنی میں اپنی سوچ اور عمل کا جائزہ لیجئے، محاسبہ کرتے کرتے اگر ایسا لگے کہ ابھی آپ کو اور مضبوط ہونا ہے تو اپنے آپ کو خوب سے خوب تر بنائیے۔ یہاں ہم اپنے نوجوان دوستوں کو دو مشورے دینا چاہیں گے۔

پہلا مشورہ یہ ہے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کریں۔ پڑھیں بھی تو اس طرح کہ آپ کے ہاتھوں میں قلم اور ایک نوٹ بک ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن کی آیات مبارکہ اور ان میں آئے ہوئے الفاظ کے معانی و مطالب لکھ کر یاد کریں، اگر ہمارے کہنے سے پہلے ہی قرآن مجید کے نوٹس Notes لے کر پڑھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ اپنی اس عادت کو برقرار رکھئے Keep it up ۔ محترم پرویز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا درس

سننے کے بعد جب کبھی کوئی نوجوان طالب علم اپنی ڈائری یا آٹوگراف بک ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہتا کہ سر! پلیز اپنے آٹو گراف دے دیجئے تو پرویز صاحب ذرا سا سر جھکا کر اپنے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں سے بظاہر بے نیازی کی ایک نظر ڈالتے ہوئے آٹوگراف مانگنے والے نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھتے اور حکم دینے کے انداز میں فرماتے کہ ''میرے درس کو لکھ لیا کرو یہی میرے آٹوگراف ہیں'' محترم پرویز رحمۃ اللہ علیہ اپنے دروس میں کہا کرتے تھے کہ ان حوالوں کو نوٹ کرتے جایئے، ان باتوں کو لکھتے جایئے جو میں بتا رہا ہوں یہ آپ کے کام آئیں گی۔ آج ہمارے زمانے میں ایسے خوش نصیب مل جائیں گے جنہوں نے پرویز صاحب کے درسوں کو Live سنا بھی اور سمجھا اور لکھا بھی اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد وقتاً فوقتاً اپنے بچوں کو اور ملنے جلنے والوں کو فخریہ انداز میں اپنی ڈائریوں اور نوٹ بکس میں لکھے ہوئے درسوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ ہم نے یہ نوٹس Notes آج سے تیس سال یا چالیس سال یا پچاس سال پہلے لکھے تھے۔ قرآن مجید کی بہت ساری خوبیوں میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے نزول کے پہلے دن سے ہی "آج" کے لئے ہے۔ قرآن آسمانی اصول وقوانین کی ایک ایسی لازوال کتاب ہے جو اپنی اشاعت کے روز اول سے ہی زمانہء حال کے لئے ہے، یہ ایک ایسی خوبی ہے جو دنیا کی کسی کتاب کی نہیں ہے۔ پرویز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بتائے ہوئے قرآن فہمی کے طریقے کہ "قرآن کو قرآن ہی سے سمجھئے" کے اصول کے مطابق اگر آپ قرآن کی آیات لکھ کر پڑھنے اور سمجھنے لگیں گے تو آپ کے آج کے لکھے ہوئے نوٹس (Notes) جو آج آپ کے کام آئیں گے تو کل آپ کے بچوں کے کام آئیں گے۔ اس لئے کام آئیں گے کہ قرآن ہر زمانے کے "حال" یعنی Present کے لئے ہے۔ ہمارا دوسرا مشورہ پڑھنے کے ساتھ دیکھنے اور سننے سے متعلق ہے۔ ملکی اور غیر ملکی حالات حاضرہ (Current Affairs) اور International Affairs سے باخبر رہنے کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ اخبارات، رسائل اور مختلف کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ملکی اور غیر ملکی مختلف ٹی وی چینلز دیکھنے اور ایف ایم ریڈیوز کے بہت سارے چینلز بھی سننے ہوں گے۔ نوجوانوں میں مطالعے کی عادت Reading Habit بہت ہی کم ہوگئی ہے، ان کو مطالعے کی عادت ڈالنا ہوگی۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو بہت تیز کر دیا ہے خاص طور پر مغربی ممالک نے اپنے الیکٹرانک میڈیا کو اتنا تیز رفتار بنا دیا ہے کہ ہمارا ایک عام پاکستانی بھائی ان کی تیز رفتار نشریات میں موجود ان کے نظریات اور مقاصد کو شاید ہی سمجھ سکے۔ (ملکی اور غیر ملکی میڈیا کی نشریات کے بارے میں ہم طلوع اسلام کی آنے والی اشاعتوں میں لکھیں گے)

ہم نوجوان دوستوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ قرآن کریم کے معیار کے مطابق مومن اور پھر مسلم بننا آسان کام نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں تو مسلمان بننا تو اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ایک چھوٹا اور آسان سا حکم ہے کہ صاف اور سیدھی بات کیا کرو، سچی بات کیا کرو، کسی معاملے میں گواہی دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اللہ کی طرف سے گواہ بن کر سچی گواہی دو، لفظوں کو توڑ مروڑ کر گواہی نہ دو، تمہارا سچ تمہارے اپنے، تمہارے والدین اور اقربین کے خلاف جائے

تب بھی تم کو سچ ہی کہنا ہوگا۔اس ایک حکم کی روشنی میں اپنا محاسبہ کیجیے اور سوچئے کہ ہم سب اپنی روزمرہ کی زندگی میں انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کے فقط اس ایک حکم پر کس حد تک عمل کر رہے ہیں؟

زندگی میں کچھ اچھا کرنے کی تمنا بڑی اچھی بات ہے لیکن اچھا کرنے کے لئے پہلے اچھا بھی تو بننا پڑے گا نا! اتنا اچھا بننا پڑے گا کہ آپ کے کردار کی اچھائیوں کے بارے میں اپنے اور بیگانے سب گواہی دیں کہ ہاں یہ ایک اچھا انسان ہے۔وہ شخص جو اللہ اور رسول کے احکامات پر عمل نہیں کرتا کفر کرتے ہوئے شہروں میں فساد پھیلاتا ہے، جہاں جاتا ہے' جہاں رہتا ہے' اس جگہ کو جہنم بنا دیتا ہے۔کافر دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے جبکہ مومن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے' جہاں رہتا ہے' وہ جگہ جنت بن جاتی ہے۔مومن اپنی جنت اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔اس نور کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے جو قرآن کی صورت میں نازل ہوا ہے۔اپنے راستے کو بھی روشن رکھتا ہے اور جو اس کے ساتھ چلنا چاہیں ان کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کی اپنی دنیا میں اسے حیاتِ طیبہ حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے گھر والے اور پڑوسی چین اور سکون سے رہتے ہیں۔مومن کی شخصیت باغ و بہار ہوتی ہے اپنی ذات میں انجمن ہوتا ہے، لوگ اپنے پاس بٹھا کر اپنے دکھ سکھ اور اپنا حال دل سنانے کے لیے اس کے انتظار میں گویا یہ سوچتے رہتے ہیں کہ:

تو آئے تو لگتا ہے اپنی بھی سحر ہو گی
انداز ہیں سب تیرے سورج کی کرن والے

اے مومنو! ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے، تم اپنے ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرو، ایسا کبھی نہ کرو کہ زبان سے بڑے بڑے دعوے کرو اور انہیں عملاً پورا کر کے نہ دکھاؤ، جو کچھ زبان سے کہو اسے عمل سے پورا کر کے دکھاؤ، قول و فعل میں ہم آہنگی ایمان کے دعوے کی صداقت کا ثبوت ہے، اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں، اللہ کے نزدیک یہ بات قابل مذمت اور قابل گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے۔(اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خالی باتیں کرتے ہیں بلکہ) اللہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے (جو وقت پڑنے پر) سربکف میدان جنگ میں نکل آتے ہیں۔(الصّف:4-2)

☆.....☆.....☆

انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ جس چیز کو وہ صحیح سمجھتا ہے اُس کے خلاف عمل کرے۔

(علامہ پرویزؒ)

سید فیروز شاہ، گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیران کن عدالت

حالانکہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہے لیکن پاکستان کے ہر حکومتی شعبے میں حقیقی پارلیمانی نظام کو نظر انداز کیا جاتا ہے مثلاً اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کی تقرری کے لئے ہمیشہ سے میرٹ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اور اہلیت کے حامل وکلاء سے درخواستیں نہیں لی جاتیں۔ پارلیمانی جمہوریت کے نمائندہ ملک برطانیہ میں ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرری کے لئے ایک آزاد جوڈیشل اپائنٹمنٹ کمیشن ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نے فیصلہ کیا کہ منٹگمری کی عدلیہ کے بارے میں اپنی معلومات میں کچھ اضافہ کروں۔ چنانچہ کنفیڈریٹ وہائٹ ہاؤس سے جہاں میری بیٹی نے مجھے صبح صبح اتارا تھا میں مغرب کی طرف چل پڑا۔ صبح کا وقت تھا اس لئے سڑک پر بہت کم لوگ تھے۔ اچانک مجھے سڑک پر صفائی کرنے والا ایک شخص نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کورٹ روم کس طرف ہے۔ اب اس نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کس کورٹ روم کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ وہاں اسٹیٹ کے سپریم کورٹ کے علاوہ وفاق کا ڈسٹرکٹ بھی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نچلے درجے کی عدالت کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس طرف پہاڑی کی طرف چلے جاؤ۔ چلتے چلتے ایک جگہ مجھے ایک عمارت پر 15th جوڈیشل سرکٹ لکھا ہوا ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہاں کا کاؤنٹی (ضلعی) کورٹ تھا۔

عدالتوں کے سامنے برآمدے میں گھومتے ہوئے مجھے ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اس عدالت میں عدالتی کاروائی جاری تھی۔ چنانچہ میں اس میں داخل ہوگیا۔ اور وکلاء کے لمبے سے بنچ کے پیچھے بیٹھ گیا اور عدالتی کاروائی دیکھنا شروع کردی۔

امریکہ میں عدالتوں میں کوئی وکیل کالا کوٹ نہیں پہنتا اور نہ ہی ہمارے ہاں کی طرح وکلاء گاؤن پہنتے ہیں۔

اس عدالت کے سیاہ فام امریکی جج کا نام جونی ہارڈوک (Johnny Hardwick) تھا۔ جج صاحب اور دیگر

لوگوں نے مجھے وکیل سمجھا ہوگا اس لئے کہ میں نے بھی وہاں موجود وکلاء کی طرح گرے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں جج صاحب نے ایک فائل اٹھا کر ایک نام پکارا۔ اس پر ساتھ کے کمرے سے ایک باوردی اہلکار اپنے ساتھ نارنجی رنگ کے جیل کے لباس میں ایک شخص کو لے کر عدالت کے سامنے آ گیا۔ ملزم کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ملزم کا وکیل بھی اٹھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

ملزم کو دیکھ کر جج صاحب نے مسکراتے ہوئے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے صبح کا سلام گڈ مارننگ کہا اور مزاج پرسی کی۔ ان کے الفاظ تھے:

"Good Mornig John, how are you this morning"

ملزم نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ شکریہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔

جج اور ملزم کے درمیان جملوں کا یہ تبادلہ میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔ پاکستانی عدالتوں میں اس قسم کا ماحول اور جج کا ایسا رویہ ناممکن سی بات ہے۔

پھر جج صاحب نے ملزم سے پوچھا کہ تمہاری طرف سے تمہارے وکیل نے جو کاغذات جمع کئے ہیں کیا تم نے ان کو پڑھا اور سمجھا ہے۔ ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔

> یعنی پلوٹو کریسی کا مطلب دولت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا ہے جہاں معاشی عدم مساوات زیادہ ہوتی ہے (امیر لوگ) سیاسی عمل پر غیر متوازن طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جہاں قلیل تعداد میں انتہائی امیر لوگ حکومت پر کنٹرول کے ذریعے مالی فوائد پر قابض ہو جاتے ہیں۔ قلیل تعداد میں یہ پلوٹو کریٹ لوگ، انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔

اس کے بعد جج صاحب اور وکیل کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور جج صاحب نے کچھ فیصلہ لکھوا دیا اس کے بعد ایک نوجوان خاتون ملزمہ پیش ہوئیں۔ اسے بھی جج صاحب نے گڈ مارننگ کہہ کر مخاطب کیا اور اس کا حال پوچھا اور دو منٹ میں عدالتی کاروائی ہو گئی۔

میرے لئے وہاں کی عدالتی کاروائی اس قدر مسحور کن تھی کہ میں تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھ کر دیکھتا رہا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے ہر ملزم قابل عزت شہری ہوتا ہے۔

آخر میں جج صاحب کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے پوچھا کہ میرا کیا معاملہ تھا۔

میں نے کہا کہ میرا تو کوئی معاملہ وہاں نہیں تھا اور یہ کہ میں پاکستان سے آیا ہوا وکیل ہوں اور یہاں عدالتی کاروائی دیکھنے کے لئے آیا تھا۔

جج صاحب نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے مجھے ویلکم کہا اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کچھ وقت ہے۔ میں نہ کہا جی ہاں۔ میں تو یہاں ایک سیاح ہوں اور مجھے کوئی خاص کام کرنے کو نہیں ہے۔ جج صاحب نے کہا پھر تو میرے

ساتھ لنچ کرو۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے رضامندی ظاہر کردی۔ انہوں نے مجھے کورٹ روم میں انتظار کرنے کو کہا اور اٹھ کر پچھلے کمرے میں چلے گئے۔

چند منٹ بعد وہ عدالتی چغہ اتار کر واپس آئے اور مجھے لے کر عدالت کی عمارت سے باہر آ گئے۔ سامنے سڑک کی دوسری طرف لوکل گورنمنٹ کی عمارت تھی۔ وہ مجھے لیکر وہاں کی کینٹین میں لے گئے۔ ہم نے اپنی اپنی ٹرے اٹھا کر اپنی پسند کا کھانا لیا جس کی ادائیگی جج صاحب نے کی۔ کھانا لیکر ہم ایک بڑی سی گول میز پر آ بیٹھے۔ ہمارے ساتھ ایک وکیل بھی آ کر بیٹھ گئے۔ جج صاحب نے میرا تعارف ان وکیل صاحب سے کرایا۔ اس وقت ہماری میز پر وردی میں ملبوس ایک لمبا چوڑا گورا بھی اپنا کھانا لے کر آ گیا۔

جج صاحب نے باوردی شخص سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ منٹگمری کی پولیس کا سربراہ (شیرف) تھا۔

کھانا شروع کرنے سے پہلے جج صاحب کے اشارے پر ہمارے گورے وکیل ساتھی نے سر جھکا کر دعا مانگی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اتنا اچھا رزق عطا کیا تھا۔ سب نے ہلکی آواز میں آمین کہا اور کھانا شروع کر دیا۔

> پٹیشن کے جواب میں الیکشن کمیشن آف پاکستان نے حامی بھر لی تھی کہ اگر عدالت کہتی تو وہ سیاسی جماعتوں کے اندرونی انتخابات کی نگرانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس طرح غریب عوام کی گردنوں سے امیر شاہی کے ایک شکنجے کو ہٹانے کے لئے عدلیہ کے ذریعے ایک اور کوشش ناکام ہوگئی۔

کھانے کے دوران جج صاحب نے شریعت کے قوانین کے متعلق کچھ سوالات کئے جن کا میں نے مختصر الفاظ میں جواب دیے۔ تفصیلی بحث کا تو کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ لیکن جج صاحب اسلامی شریعت کے بارے میں جو دلچسپی ظاہر کر رہے تھے وہ میرے لئے باعث حیرت تھی۔

میرے پوچھنے پر جج صاحب نے بتایا کہ جج بننے سے پہلے وہ خاصا عرصہ وکالت کرتے رہے تھے اور وہ انتخاب میں حصہ لے کر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر جج بنے تھے اور الاباما ریاست کے قانون کے مطابق ان کا تقرر کچھ سال کے لئے تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ انتخاب میں حصہ لے کر آئندہ چھ سالوں کے لئے جج بن سکیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ریاست الاباما کے سپریم کورٹ کے جج بننے کے لئے سینئر وکلاء کو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس طریقہ کار کو زیادہ اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ریاستی سپریم کورٹ کے جج کا حلقہ انتخاب خاصا بڑا ہوتا ہے۔ جہاں انتخاب کے لئے بہت زیادہ اخراجات ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس نظام میں بہتری لانے کے لئے ان دنوں کافی سوچ بچار ہو رہی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ انتخاب میں حصہ لینے سے پہلے وکیل کے بارے میں وہاں کے لاء سکولوں، بار اور این جی اوز کی کمیٹیوں سے ان کی رائے لی جاتی ہے اور خراب شہرت رکھنے والے وکیل کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے

کہ امریکہ میں عدلیہ میں کرپشن اور نااہلی کی خبریں شاذونادر ہی نظر آتی ہیں۔ بلکہ میں نے تو ایک دفعہ بھی کوئی ایسی خبر نہ پڑھی نہ وہاں کے ٹی وی کے مباحثوں میں ایسا کوئی ذکر ہوا۔

اس کے برعکس پاکستان کے معاملے میں اگرچہ نچلی سطح کی عدلیہ میں تو مقابلے کے امتحان ہوتے ہیں تاکہ میرٹ معلوم کیا جاسکے لیکن ملک میں جیوری کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے اور چیک اینڈ بیلنس نہ ہونے کی وجہ سے عوام موجودہ نظام سے ناخوش ہی رہتے ہیں۔ پاکستان میں اعلیٰ عدلیہ کا تقرر میرٹ کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد چیف جسٹس صاحبان اور سیاستدانوں کی ذاتی پسند پر ہوتی ہے۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہے لیکن پاکستان کے ہر حکومتی شعبے میں حقیقی پارلیمانی نظام کو نظر انداز کیا جاتا ہے مثلاً اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کی تقرری کے لئے ہمیشہ سے میرٹ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اور اہلیت کے حامل وکلاء سے درخواستیں نہیں لی جاتیں۔ پارلیمانی جمہوریت کے نمائندہ ملک برطانیہ میں ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرری کے لئے ایک آزاد جوڈیشل اپائنٹمنٹ کمیشن ہوتا ہے۔ جس کے پندرہ اراکین میں سے پانچ سینئر جج ہوتے ہیں بقیہ دس اراکین مشہور وکیل، دانشور، سول سوسائٹی کے نمائندے ہوتے ہیں۔ جن کا حکومتِ وقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی سیاستدان اس کمیشن کا ممبر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں عدلیہ کا معیار اور اس کی شہرت نہایت اعلیٰ ہوتی ہے اور جہاں قانون کی حکمرانی یقینی نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں اگر کوئی کہے کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام ہے تو اس سے بڑی غلط بیانی کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سویلین پلوٹوکریسی (امیر شاہی) کے حکومتوں کے دور میں بھی (جنہیں دھوکے سے جمہوریت کہا جاتا ہے) عوام کی زندگی زیادہ سے زیادہ اجیرن ہوتی جارہی ہے۔ ڈیموکریسی دو الفاظ سے بنتی ہے۔ ڈیمو کا مطلب عوام کریسی کا مطلب حکومت ہوتا ہے جبکہ پلوٹو کا مطلب دولت ہوتا ہے۔ ڈیموکریسی (جمہوریت) کی ضد پلوٹوکریسی (امیر شاہی) کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

"Plutocracy refers to rule of power through wealth, where degree of economic inequality is high. The wealthy have disproportionate influence on the political process, and where a very small percentage of extremely rich individuals control the government appropriating most of the financial benefits. These plutocrats also control the executive, legislative and judicial aspects of the government."

یعنی پلوٹوکریسی کا مطلب دولت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا ہے جہاں معاشی عدم مساوات زیادہ ہوتی ہے(امیر لوگ) سیاسی عمل پر غیر متوازن طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جہاں قلیل تعداد میں انتہائی امیر لوگ حکومت پر کنٹرول کے ذریعے مالی فوائد پر قابض ہوجاتے ہیں۔قلیل تعداد میں یہ پلوٹوکریٹ لوگ، انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔

> کراچی میں گجراتی بولنے والے میرے عمر رسیدہ صنعتکار دوست اپنی زبان میں صدیوں پرانی ایک مشہور کہاوت سنایا کرتے ہیں کہ جہاں کا راجا بیوپاری۔۔۔وہاں کی پرجا بھکاری

مقتدرہ قوی زبان کی سیاسی لغت میں پلوٹوکریسی کے معنی دھن راج، قارونیت، امیر شاہی ہیں جو حرف بحرف پاکستان کے موجودہ سیاسی نظام کو واضح کرتے ہیں۔

میں نے 2011ء میں پاکستان کی عدالت عظمیٰ میں پلوٹوکریسی کے خاتمے کے لئے سیاسی جماعتوں میں جمہوریت کو لازمی طور پر نافذ کرنے کے لئے پٹیشن دائر کی تھی جو 2015ء میں رد کردی گئی۔حالانکہ پٹیشن کے جواب میں الیکشن کمیشن آف پاکستان نے حامی بھر لی تھی کہ اگر عدالت کہتی تو وہ سیاسی جماعتوں کے اندرونی انتخابات کی نگرانی کرنے کے لئے تیار تھا۔اس طرح غریب عوام کی گردنوں سے امیر شاہی کے ایک شکنجے کو ہٹانے کے لئے عدلیہ کے ذریعے ایک اور کوشش ناکام ہوگئی۔اُمید کی جاسکتی ہے کہ عدلیہ خود Suo Moto کے عمل سے امیر شاہی کی سیاسی جماعتوں کے غیر آئینی وجود کو ختم کردے گی تاکہ متوسط طبقے کے عوام دوست لوگ سیاست میں مؤثر کردار ادا کرسکیں۔

کراچی میں گجراتی بولنے والے میرے عمر رسیدہ صنعتکار دوست اپنی زبان میں صدیوں پرانی ایک مشہور کہاوت سنایا کرتے ہیں کہ

جہاں کا راجا بیوپاری ۔۔۔۔۔وہاں کی پرجا بھکاری

یعنی جہاں سیاسی اقتدار امیر کاروباری لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے وہاں عوام شدید غربت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

موجودہ حالات میں اب یہ ذمہ داری میڈیا پر آجاتی ہے کہ وہ عوام کی آگاہی کے لئے موجودہ امیر شاہی (پلوٹوکریسی) اور جمہوریت (ڈیموکریسی) کے فرق کو بار بار واضح کرتے رہیں تاکہ باشعور عوام اچھی حکمرانی کے لئے متوسط طبقے کے عوام دوست جمہوری لوگوں کو منتخب کرسکیں اور پلوٹوکریسی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کرسکیں۔

(ماخوذ از ''امریکہ۔ایک انوکھے ملک کا منفرد سفرنامہ'')

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریۂ پاکستان والی
اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:4

اِنسانی ذات میں عقل کی صلاحیت سے الحق کے علم کی رسائی

اِنسانی ذات کو اللہ کی طرف سے درجِ ذیل دو صِفات کی صلاحیت سے پوشیدہ صورت میں نوازا گیا ہے۔

1۔ فہمِ الحق میں عِلم کے حصول کے لئے عقل کی صلاحیت اور

2۔ اِنسانی اعمال میں آزادیِ اِرادہ سے انتخاب کرنے کی صلاحیت

مُضمِر شکل میں ودیعت کردہ اُن دونوں صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اعمال کی نظر نہ آنے والی صورت میں ارسطو کے الفاظ میں ظاہر کرنے سے اِنسانی ذات کی صورت کا اظہار سامنے آتا ہے۔ ہر لہٰذا اِنسانی ذات کی تفہیم کے لئے ہمیں اِن دونوں صلاحتوں کے مؤقف کو ہر زاویہ سے سمجھنے کے لئے پورا باب مختص کرنا ہوگا۔ اِس ضِمن میں دیکھا گیا ہے کہا کثر اوقات میں حُبِ نفسی میں عقلِ خود بین کے جذبات کی مدد لی جاتی ہے۔ اِسے عقلِجہاں بین وسیح کرنے کے لئے کلامِ الٰہی کا نازل کردہ عِلمُ الوحی سے استفادہ کرنے کے ضرورت کا احساس ہوتا ہے، جس کی تفہیم کے لئے بھی ایک باب مختص کیا گیا ہے۔ اِن کے بعد اِنسان کے آزادیِ اِرادہ سے انتخاب کرنے کی صلاحیت کا جائزہ لینے سے اِنسانی ذات کا مؤقف نکھر کر سامنے آنے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا یہاں ہم فہمِ الحق کی عقلی صلاحیت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آغاز میں حسبِ دستور اِس کے لغوی و اصطلاحی فما ہیم جانتے ہیں۔

عِلم کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

علم کے معانی کسی چیز کو کما حقہ جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا، محکم طور پر معلوم کرنا ہے۔ اِس کی تعریف یہ کہہ کر بیان کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا نشان ہوتا ہے کہ جس سے کسی شے کی حقیقت کا اِدراک ہو کر پہچان جاسکے اور دیگر اشیاء سے متمیّز ہو سکے۔ یہ تمیز تو کسی چیز کی ذات کی اصل حقیقت کا ادراک کرنے سے ہوتی ہے یا ایک چیز پر کسی

صفت کے ساتھ حکم لگانے سے ہوتی ہے جو فی الوقع مُثبت یا منفی ثابت ہو۔علم کے یہ دو معانی ہوتے ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ فلاں شے کی حقیقت کیا ہے؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ حقیقت کس قانون کے تابع کام کر رہی ہے؟

عِلم کی ایک حیثیت سے فطری ہوتی ہے جو حواس سے حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جاتی ہے، جیسے وہ عِلم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے۔

دوسری عملی سے وہ جو عمل کے تجربی نتائج کا مشاہدہ کئے بغیر تکمیل نہ پائے۔

مغربی مفکر ہیوم کے نزدیک عِلمیت کا مفہوم راست حسی، ادراکی شعور ہے جو ارتسامات سے حاصل ہو۔ان ارتسامات کی مدہم، سادہ اور مرکب نقول جو تصورات کہلاتے ہیں اور انکے مابین اضافات بھی عِلمیت کے مفہوم میں شامل ہوتے ہیں۔

اخلاقیات کے مستند مفکر کانٹ کی عِلم کی تعریف کا موقف ہے کہ علم کا مواد تجربی اور اس کی شرائط قبل تجربی ہونے کی وجہ سے کُلی ہوتی ہیں۔

رسل کا موقف ہے کہ ہم طبعی اشیاء مثلاً میز کرسی، دنیا کا مرکز ثقل وغیرہ سے ہرگز متعارف نہیں ہوتے۔یہ چیزیں ہمارے تجربات کی منطقی تشکیل ہیں اور ان کے بارے میں ہمارا علم بیانیہ ہوتا ہے تعارفی نہیں ہے۔

درحقیقت عقل کو شعور ہی کی ایک حتمی صلاحیت کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے، لہٰذا عقل کی وضاحت، شعور کے تجزیہ سے بھی کی جاتی ہے۔شعور ایک ڈیٹا بنک ہے جہاں لمحہ بہ لمحہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ یعنی حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے معلومات جمع ہوتی رہتی ہیں. بچپن سے لیکر مرنے تک ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ہمارے حصولِ علم کے لئے حواس خمسہ کے ذریعہ سے ہمارے شعور میں جاتا ہے۔

عقل بھی شعوری صلاحیت سے عبارت ہے۔شعور میں موجود اطلاعات ومعلومات کو بروئے کار لانا اور اسی کو بنیاد بنا کر معقول نتیجہ حاصل کرنا عقل کا خاصہ ہے۔اگر عقل میں شعور کی صلاحیت یعنی اطلاعات ومعلومات ہی نہ ہوں تو وہ بذاتِ خود نتیجہ حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔اس کی مثال یہ ہے کہ کسی ان پڑھ کو حساب کا سوال دے کر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی عقل استعمال کر کے اس کا جواب دے، یا کسی ڈاکٹر سے کہا جائے کہ وہ اپنی عقل استعمال کر کے ایک پُل کا تخمینہ بنا دے۔وہ دونوں ایسا نہیں کر سکیں گے۔

کیونکہ ان کے شعور میں وہ معلومات ہی نہیں ہیں جن کے بارے میں اُن سے سوال پوچھا جا رہا ہے، عقل کیسے اس چیز کا احاطہ کر سکتی ہے جس کے بارے میں اسے معلومات ہی حاصل نہیں؟ ہمیں یہاں یہ ذہن میں چاہیئے کہ انسان کی حیوانی زندگی تک کے ارتقاء کے مقام تک عقل پر شعوری طور پر جبلی تقاضوں کا غلبہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علی نصیر عباسی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تشکیلِ معاشرہ اور قرآنی کردار

(جدید سائنس کے انکشافات)

یوم پاکستان کے موقع پر بزم طلوع اسلام کراچی (صدر) کے زیر اہتمام 31 مارچ 2002ء کو قرآنک سنٹر (صدر) میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر علی نصیر عباسی نے ''تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار'' کے موضوع پر لیکچر دیا تھا جس میں قرآنی اقدار اور عصری اکتشافات کے حوالے سے اعلیٰ کردار کی تشکیل کے ضمن میں نہایت پُرمغز اور معلومات افزا گفتگو کی گئی تھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس مفید اور کردار کی تعمیر میں ممد گفتگو سے قارئین طلوع اسلام کو محروم رکھا جائے۔ (سلیم اختر)

یہ سنہ 2002ء اور مارچ کی 31 تاریخ ہے' 23 مارچ کی یاد میں لگتا ہے کہ ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ سب کو مبارک باد ہو اور آپ سب پر سلام و رحمت ہو کہ ایک اچھے مقصد کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ورنہ بقول علامہ اسلم جیراجپوری مسلمانوں کا اجماع و اتحاد (موجودہ تاریخ) میں ہمیشہ یا اکثر باطل پر ہی ہوا ہے۔ اس تقریب سعید پر میں تمام احباب' جو یہاں موجود ہیں اور انتظامیہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر کی خدمت میں بھی دلی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ جناب محترم اقبال صاحب اور ان کی ٹیم قابل تعریف ہیں کہ یہ کام محنت طلب ہیں اور ان میں کافی ٹائم اور دوسرے Resources بھی لگتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات میں مجھے سائنسی تحقیق آپ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے تاکہ آپ کی زندگیاں سنور جائیں اور یہ ثابت ہو کہ ''قرآن حق ہے اور باقی سب افسانے یا وہم و گمان و قیاس''۔ ارشاد قرآنی ہے کہ ''ہم انہیں انفس و آفاق میں نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع حقیقت ثابتہ ہے۔'' (41:53)۔ میرا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اس آیت میں میرا شعبہ یا موضوع ''عالم انفس'' یعنی نفس انسانی کے معاملات ہیں یعنی Psychology اور

> پاکستان کی تشکیل ہو یا کسی بھی معاشرہ کی تعمیر و بقا' اس کا دارومدار ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' پر ہی ہے اور ہمیشہ یہی قانون رہا ہے اور رہے گا۔ ماضی قریب میں (1947ء) آزادی و تشکیل ملک پاکستان کی وجہ بھی ''کردار'' تھا اور مزید ترقی و بقا بھی ''قرآنی کردار'' کے ذریعے ہی سے ہوگی ورنہ نہیں۔

Psychiatry وغیرہ۔ ڈاکٹر ودود ''عالم آفاق'' سے بحث کرتے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت دے۔ ایسے انسان اور عالم شاید ہی مسلمانوں میں پیدا ہوں۔ آج کی اس بامقصد محفل میں ایسے ہی معاملات سیکھیں گے۔ تاکہ ہمارے دل و دماغ بدل جائیں اور ہماری زندگی اعلیٰ بن سکے۔ اگر ہماری محفلیں بے مقصد ہیں، یعنی ہم ان میں کچھ اعلیٰ وارفع نہیں سیکھتے ہیں تاکہ عملی زندگی بہتر ہو تو ایسی محفلوں کا منعقد کرنا وقت کا اور زندگی کا زیاں اور محض فرار زندگی یعنی Escapism کی قسم ہے۔ اس لئے آپ سے تھوڑی سی محنت چاہوں گا۔ یعنی آپ کو تھوڑی Effort کوشش کر کے گہری توجہ قائم رکھنی ہوگی۔ قرآن حکیم اور علم نفسیات کا قانون مسلمہ ہے کہ ''بغیر محنت وجدوجہد کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا''۔ ہمارا موضوع کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری ہدایت جو نفسیاتی نوعیت کی ہے کہ میرے لیکچر کا تعلق بڑے نازک گوشوں سے ہے، اس میں عین ممکن ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں منفی جذبات واحساسات شعوری ولاشعوری طور پر پیدا ہوں۔ تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ وہ آپ کا ذاتی ردعمل (Psychosocial -Response) ہے۔ میرا مقصد آپ کے جذبات کی توہین نہیں ہے۔ اگر آپ کو یہ محسوس ہو تو یہ آپ کا ذاتی جذباتی ردعمل ہے۔ آپ کی دل آزاری میرا مقصد نہیں، ہوسکتا ہے میری اپیل آپ کی ''عقل'' یا ''Reasoning Faculty'' سے ہے جذبات سے نہیں۔ آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو تو ''علم'' حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے۔

ہمارا موضوع ہے تشکیل معاشرہ (پاکستان اس میں شامل ہے) کے لئے قرآنی کردار کی تشکیل۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'پاکستانی معاشرہ' کے لئے یا کسی اور معاشرہ کے لئے بھی ''قرآنی کردار'' کی ضرورت؟ لیکن کیوں؟ اس سے کیا فائدہ؟ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا؟ اس طرح کے زندگی کے اہم ترین مسائل پر تو تحقیق سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں ہونی چاہئے تھی۔ بہرحال کس کس بات پر روئیں اور ہمارا تحقیق سے کیا واسطہ؟ مفکر عظیم جناب پرویز صاحب نے ایک بار بڑے دکھ سے اور الم انگیز انداز میں ٹھیک کہا تھا کہ ''پاکستان میں ''علم'' جنس کا سد سمجھا جاتا ہے''۔

میں شروع ہی سے اپنا نکتۂ نظر بتا دینا چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پاکستان کی تشکیل ہو یا کسی بھی معاشرہ کی تعمیر وبقا، اس کا دارومدار ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' پر ہی ہے اور ہمیشہ یہی قانون رہا ہے اور رہے گا۔ ماضیٔ قریب میں (1947ء) آزادی وتشکیل ملک پاکستان کی وجہ بھی ''کردار'' تھا اور مزید ترقی وبقا بھی ''قرآنی کردار'' کے ذریعے ہی سے ہوگی ورنہ نہیں۔

میں یہی حقیقت جدید سائنس کی تحقیقات سے ثابت کرنا چاہوں گا۔ قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔ قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو، یہ ہی قانون ہے۔ یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آیئے مزید تفصیل سے سمجھیں یعنی سائنس کی بارگاہ میں چلتے ہیں۔

اس علم کو یا Study کو عام طور پر نفسیات میں "Characterology" کہا جاتا ہے۔ یہ اب تو ایک باقاعدہ شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اب اس کے بڑے بڑے ماہرین تحقیق و تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، خاص طور پر معاشرتی اور تنظیمی معاملات میں تشکیل کردار یعنی لیڈروں کا کردار ''اعلیٰ'' ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔ ساری کوششیں جو صدیوں سے ہو رہی ہیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

اس علم کو یا Study کو عام طور پر نفسیات میں "Characterology" کہا جاتا ہے۔ یہ اب تو ایک باقاعدہ شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اب اس کے بڑے بڑے ماہرین تحقیق و تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، خاص طور پر معاشرتی اور تنظیمی معاملات میں تشکیل کردار یعنی لیڈروں کا کردار ''اعلیٰ'' ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔

ابھی، ایک ریسرچر Sheehy نے تشکیل معاشرہ اور کردار سے متعلق 25 سالہ تحقیق کا نام ہی "Character" رکھا ہے۔ جس کی ابتداء ہی کچھ یوں ہے۔ ''اگر آپ عمل کا بیج بوئیں گے تو عادت کا پھل کاٹیں گے۔ پھر اگر عادت کا بیج بوئیں گے تو کردار یعنی کیریکٹر کا پھل کاٹیں گے اور پھر اگر کردار کا بیج بوئیں گے تو ہمیں ہماری منزل مقصود مل جائے گی'' اصل الفاظ یوں ہیں۔

"Sow an act, and you reap a habit, Sow a habit and you reap a character, Sow a character and you reap a destiny."

اس قانون کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اپنے نتائج پیش کرتی ہیں جو غور طلب ہیں مفہوم ہے کہ ''اور جیسے ہی، جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے، قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے وغیرہ۔''

"By the time they become national leaders, the candidate's character are sown... the destiny they reap will be our own".

اور آپ حضرات متوجہ ہوں کہ معاملہ غور طلب آ رہا ہے کہ

"Finally, examining how character is formed in our national leaders, is an effective way to learn about our selves."

یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہو کہ، جیسے ہم خود ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے لیڈر ''یا'' جیسے لیڈر ویسی ہی قوم'' ..... یہ ہے پیمانہ۔ ان مسائل پر گہری اور Objective Research معروضی تحقیق کرنے والے اب بھی مغرب میں بہت کم ہیں۔ تحقیق تو وہ ہی کرتے ہیں اور ان کا یہ احسان عظیم انسانیت پر ہے۔ بہر حال ان حالات میں بڑے انتظار اور مسلسل تحقیق کے بعد ہی ایسی اعلیٰ درجے کی علمی و عملی تحقیق سامنے آتی ہیں۔ جن عظیم علماء یا مفکرین نے ان معاملات کی گہری اور وسیع ریسرچ کی، ان میں ممفورڈ کا نام بہت اونچا ہے۔ بڑا عظیم عالم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر ہم پورے کردار یا

ساری شخصیت کو نہیں سنواریں گے تو ہم فیل ہوتے جائیں گے۔ جیسے کہ پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ میں ہوا۔ معاشرتی و معاشی و سیاسی لحاظ سے بیرونی طور پر ہم کچھ بھی کر لیں اگر ہم نے متوازن کردار یا Balanced Personality تعمیر نہیں کی تو ہماری تہذیب تنزل کی طرف گرتی چلی جائے گی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے' تو ضرورت مکمل نشوونما یافتہ ذات یا کردار انسانی کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

ڈاکٹر فرام' (Fromm) جنہیں شاید نوبل انعام ملنا چاہئے تھا' لیکن مغرب کی غیر منصفانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے گوارا نہ کیا۔ جو ایک عظیم نفسیاتی ماہر و معاشرتی علوم کے بلند ترین عالم ہیں۔ ان کی ساری زندگی اسی پیچیدہ ترین موضوع کی تحقیق میں گزری اور ان کی ہر کتاب تقریباً اسی معاملے کی تفسیر ہے۔ خاص طور پر ان کی کتابیں۔

"To Have or To Be", "The Anatomy of Human Destructiveness", The Sane Society".

بڑی ہی قابل قدر خدمات ہیں نوع انسانی کی۔ وہ ان نتائج پر پہنچا ہے کہ تشکیل معاشرہ کے لئے اعلیٰ کردار ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن ہی نہیں اور ایسا کرنا تو کیا۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس کے برعکس سوچ Abnormal Mind یا Destructive Character کی علامت قرار دی جاتی ہے وغیرہ۔ اس کا کہنا ہے کہ اعلیٰ کردار "Being Mode" یا "Loving Character" یا (Productive-Creative) کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن نہیں۔ مثلاً "The Anatomy of Human Destructiveness" میں جو ایک....Pioneering Research ہے اور آج تک یعنی سنہ 2002ء تک' اس کے پائے کی تحقیق نظر نہیں آتی۔ ساری کتاب میں صاف بتایا گیا ہے کہ برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں مثلاً Hitler (ہٹلر) اور Stalin (سٹالن) وغیرہ کے کردار کا نتیجہ انسانیت اب تک بھگت رہی ہے۔

> کہ ''اور جیسے ہی' جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے' قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے

لینن (Lenin) کی ساری زندگی کی جدوجہد کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے دیکھیے!

لینن کی عظیم جدوجہد سے روس آزاد ہوا اور ایک معاشرتی تجربہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ لینن کردار یعنی کیریکٹر کا قائل نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے آخری وقت میں اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ جب کہ (Stalin) سٹالن کو اقتدار دیا جا رہا

تھا۔تو اس نے وصیت کی کہ ایسا نہ کریں۔لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔تاریخ گواہ ہے کہ روسی قوم نے Stalin کے کیریکٹر یا کردار کا بیج بو یا اور وہ دیکھو! آپ کے سامنے روسی قوم کا نظام تباہ ہو گیا۔صدیوں کی محنت اور عظیم قربانیاں بے کار ہو گئیں۔ آج اس تجربہ کے نتیجے عبرت کے لئے باقی ہیں۔ساری انسانیت کے لئے یہ رک کر سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ اس طرح کے جذباتی فیصلوں کا انجام ایسا ہی ہوگا۔

فرام کی آخری عظیم تحقیق "To Have or To Be" تو نام سے ہی ظاہر ہے۔اس میں بھی وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اعلیٰ انسانی معاشرہ "Good Society" صرف اور صرف اعلیٰ انسانی کردار کا ہی نتیجہ ہے۔اور برا یا ''انسانیت کش معاشرہ'' انسانیت کش کردار سے پیدا ہوتا ہے۔جسے وہ "Having Mode" کہتا ہے۔ "Having Mode" کا تجربہ تو ہمیں ہر پل ہو رہا ہے۔اس کے تجربے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ساری دنیا اسی کردار کے نتائج بھگت رہی ہے۔

اور آپ حضرات متوجہ ہوں کہ معاملہ غور طلب آ رہا ہے کہ "Finally, examining how character is formed in our national leaders, is an effective way to learn about our selves."

یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہو کہ جیسے ہم خود ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے لیڈر ''یا'' جیسے لیڈر ویسی ہی قوم''..... یہ ہے پیمانہ۔

1997ء میں ڈاکٹر Bennis نے اپنی ساری زندگی کی تحقیق پیش کی ہے۔اس کا بین الاقوامی مقام ہے اور لیڈر شپ اور "Organizations" کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ڈاکٹر بینس کے نتائج بھی غور طلب ہیں نوع انسانی کے لئے۔سنئے دل کے کانوں سے۔

''ہماری کامیابی و ناکامی کا دارومدار ہر طرح کی تنظیم میں (چھوٹی تنظیم سے قومی تنظیم تک) تنظیموں کی اوپری سطح کے کردار کی نوعیت و معیار (Quality) پر مبنی ہے۔''

"The Success and failure of all organization, rests on the percieved quality at the top."

اور یہ کہ ''ہم لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتے' کوئی کام ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ہماری زندگی کا دارومدار لیڈروں کے کردار کی نوعیت و معیار پر مبنی ہے''۔

"We can not function with out leaders. Our quality of life depends on the quality of our Leaders."

یعنی پھر قرآنی آیات کا مفہوم ہے کہ جیسے ہم ویسے لیڈر یا جیسے ہمارے لیڈر ہوں گے ویسی ہی قوم۔آگے سنئے یہ سائنس دان کیا کہتا ہے:

''250 ملین امریکیوں کی زندگی کا دارومدار ہی لیڈر شپ پر ہے۔ہمارا سارا کلچر یا سسٹم بحران زدہ ہے اور یہ بحران

بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اپنا راستہ بھول چکا ہے۔ نشے کی لت کے معاملے میں ہم نمبر 1 (ایک) قوم ہیں۔ سارا معاشرہ، تمام تنظیمیں اور ادارے Institutions بحران میں ہیں۔ کیونکہ ہماری لیڈرشپ کا کردار یا کیریکٹر گر چکا ہے۔ یعنی ہمارے امراض کی تشخیص دراصل لیڈرشپ کا بحران ہے۔ جس سے سارے کے سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جب لیڈرشپ کا معیار (Quality) گرے گا مسائل حیات بڑھ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر دماغ کے کام ہی نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح سے معاشرہ لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتا ہے اور اس طرح سے تنزل و تباہی جاری رہے گی۔ جب تک لیڈروں کے کردار ٹھیک نہیں کریں گے ہم بحران زدہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔ یعنی پہلا کرنے کا کام اعلیٰ کردار کے لیڈر بنانا ہے اور پھر معاشرتی نظام بلند ہو سکے گا۔''

> ''اگر ہم پورے کردار یا ساری شخصیت کو نہیں سنواریں گے تو ہم فیل ہوتے جائیں گے۔ جیسے کہ پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ میں ہوا۔ معاشرتی و معاشی و سیاسی لحاظ سے بیرونی طور پر ہم کچھ بھی کر لیں اگر ہم نے متوازن کردار یا Balanced Personality تعمیر نہیں کی تو ہماری تہذیب تنزل کی طرف گرتی چلی جائے گی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے، تو ضرورت مکمل نشوونما یافتہ ذات یا کردار انسانی کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ لیڈرشپ ہے کیا بلا؟ ڈاکٹر بنیس کا یہ جواب انتہائی غور طلب ہے۔ سنئے! وہ کہتا ہے۔

''لیڈرشپ اعلیٰ کردار کا دوسرا نام ہے۔ (Leadership is Character) یا دوسرے الفاظ میں یہ "Integrated Adult" کو کہتے ہیں۔ (نشوونما یافتہ ذات) اور مزید سمجھاتا ہے کہ 'اس کے معانی ہیں کہ 'بحیثیت انسان 'ہم' کیا ہیں؟''

(Who we are as Human Being?) اور لیڈر کی تشکیل کا عملی طریقہ (process) وہی ہے جو اعلیٰ درجہ کا انسان بننے کا طریقہ ہے۔''

ڈاکٹر فرام اپنی عظیم کتاب "The Art of Loving" میں اس امر کی وضاحت کتاب کے آخری باب میں یوں کرتے ہیں کہ ''اگر اعلیٰ کیریکٹر کی خصوصیات عملی طور پر ہماری قوم کی زندگی میں مسلسل و متواتر منتقل نہیں ہوں گی تو کچھ بھی کر لیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب نیست و نابود ہو جائے گی۔''

ابراہیم میسلو (Maslow) کا شمار بھی دنیا کے عظیم مفکرین اور نفسیات کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھی عبرت انگیز و پر از نصیحت نتائج پر پہنچتا ہے کہ ''اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ اعلیٰ کردار شرط اولین ہے اگر اعلیٰ کردار سازی پر معاشرہ نے توجہ نہیں دی تو ہمارا وجود مٹ جائے گا۔''

آپ نے دیکھا کہ کہاں پہنچ گئے ہیں یہ علماء یا سائنسدان اور مفکر؟ دیکھئے اور غور کیجئے کہ قرآن کی آواز کہاں سے ابھر رہی ہے۔ کیا قرآن حکیم نے سچ نہیں کہا کہ ''ہم انہیں عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاکہ یہ بات

ابھر کران کے سامنے آ جائے کہ قرآن فی الواقع حقیقتِ ثابتہ ہے‘‘۔

پھر عرض کروں گا کہ کوئی بھی کام ہو‘ کوئی بھی انسانی زندگی کا معاملہ ہو اس میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی ترقی ممکن نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی قانون حق ہے۔ موجودہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم قومیں‘ اور ہماری تباہی و بربادی و بحران کے معاملے‘ جس کے ہم عین گواہ ہیں ان سب معاملات کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔ یعنی لیڈرشپ کا معیار اعلیٰ نہیں ہے۔ یعنی قرآنی کردار کی کمی یا نہ ہونا ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دنیائے علم جدیدہ کے یہ ماہرین جو تفصیل اس کردار کی بتاتے ہیں کہ جس کے بغیر بات بنتی نہیں ہے‘ تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے اور بات ہے بھی باعث رشک کہ وہ قالب یا "Pattern" یا "Design" بھی قرآنی کردار کی (غیر مکمل) سی تفصیل ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ آج متمدن دنیا اپنی تحقیق سے اس مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے جس کا انکار وہ عملی طور پر صدیوں سے کرتی چلی آئی ہیں۔ نامور مفکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جو مشرق و مغرب کا گہرا تجزیہ و مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلامی تہذیب کے بڑے عالم ہیں۔ اپنی تحقیق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے:

> ’’لیڈرشپ اعلیٰ کردار کا دوسرا نام ہے۔ (Leadership is Character) یا دوسرے الفاظ میں یہ "Integrated Adult" کو کہتے ہیں۔ (نشوونما یافتہ ذات) اور مزید سمجھاتا ہے کہ ’اس کے معانی ہیں کہ ’بحیثیت انسان ’ہم‘ کیا ہیں؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس مقام پر فاروق اعظمؓ (حضرت عمرؓ) اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔‘‘ (الفتنۃ الکبریٰ)۔

یورپ اور امریکہ کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین دن تھا‘ جب ان کی درسگاہوں سے یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن یا اسلام بھی دوسرے مذاہب عالم کی طرح ایک مذہب یعنی محض "Religion" ہے اور مذہب کو تو وہ تیاگ چکے تھے۔ قرآن حکیم کو بھی وہ عین اس مقام پر لے آئے۔ دنیا کے تمام مذاہب تو مغرب کے علماء کے نزدیک افسانے بن کر رہ گئے تھے جو حقائق کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے اور دنیا نے مغرب کے دوسرے مذاہب کے خلاف جو ردعمل اختیار کیا‘ اس کی شدت میں بغیر تحقیق کیے یہ جذباتی فیصلہ عام طور پر نافذ کر دیا جس کے نتائج یہ نکلے کہ وہ قرآنی حقائق کی طرف سے اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اس گناہ عظیم کے بعد کس طرح پھر حقائق قرآنی ان کے سامنے آ سکتے تھے۔ مزید یہ کہ ہمارے موجودہ کردار نے بھی تو انہیں روک رکھا ہے کہ ایسے ہوتے ہیں مسلمان جیسے ہم ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم دوگنے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

اب ہم آتے ہیں تشکیل پاکستان کی طرف‘ کہ اس کا کردار سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ہم وقت کی کمی اور دوسرے

محرکات کی وجہ سے اختصار سے کام لیں گے۔

انیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا سلطنت مغلیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستان زوال' مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے گزر رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مسلمانان ہند کے زوال وشکست کی یہ تاریک رات عہد رفتہ میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی کہ 1857ء کی بغاوت ہند' شدت جذبات کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ یہ جرات مسلمانوں کو بڑی ہی مہنگی پڑی اور انگریزوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور یہ دونوں مظلوم و نہتے مسلمانوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آتش انتقام سے محکومی ومحرومی ومظلومی' غربت وافلاس' بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے چاروں اطراف سے مسلمانان ہند کو گھیر چلے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی گویا کہ ایک قبرستان سی بن گئی تھی۔ چاروں طرف حسرت و مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور نظر آتا تھا کہ یہ قوم اب گری یا اب۔ جیسے کہ موت کا انتظار ہو۔ یہ دم توڑتی ہوئی قوم عالم سکرات میں ایک بار پھر نشاۃ ثانیہ اختیار کر سکے گی' زندہ ہو سکے گی' ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی ایسا کر سکتا تھا۔ یہ معجزہ ہوا۔ وہ معماران پاکستان کے کردار Character کا معجزہ تھا۔ ان کے عظیم کیریکٹر نے پھر سے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ قومی زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم و جلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہم اغیار کی غلامی اور محکومی میں مزید تباہ و برباد ہو رہے ہوتے جیسا کہ پچھلے پچاس سالوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اور موجودہ ہندو مسلم فسادات میں جو حالت زار مسلمانوں کی ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلکیاں آپ کے سامنے آتی ہیں۔ باقی حقائق ظلم وستم کے بارے میں پروپیگنڈا (Propaganda) اور دوسرے طریقوں کی وجہ سے سامنے نہیں آسکتے ہیں۔

ہماری نشاۃِ ثانیہ کی داستان سرسیدؒ سے شروع ہوئی اور اقبالؒ سے ہوتی ہوئی عظیم رہنما جناحؒ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ جیت اور تشکیل معاشرہ ان تینوں کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی ان کے کردار کے قائل ہیں۔ میں ان تینوں میں سے صرف آخری کڑی محترم جناح کے کردار کے متعلق بہت مختصر سی بحث کروں گا۔ ویسے تو ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑا سا کہتا چلوں مثلاً علامہ اقبال جو بظاہر ہمیں لگتا ہے کہ بس محض ایک شاعر و فلسفی سے ہی تھے۔ لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ساری زندگی انہوں نے مسلمانان ہند اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کے لئے ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیتیں کہیں اور لگاتے' وہ اتنی تھیں کہ ''فورڈ'' وغیرہ سے بھی آگے ہوتے دولت و دنیاوی معاملات میں۔

ہم بات قائداعظمؒ کی کر رہے تھے۔ سرسید و اقبال کی جدوجہد شاید بے کار چلی جاتیں اگر جناح ان کی کی ہوئی محنت کو ساحل مراد تک نہ پہنچاتے۔ عظیم انسان و مفکر پرویز صاحب سے بڑا گواہ اور کون ہوگا۔ انتہائی مستند گواہ۔ وہ جائزہ لیتے ہیں کہ ''جناح نے پورے دور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈرشپ

کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیا حیرت انگیز ہے سیاسیات ہند کی تصویر کا دوسرا رخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی جناح کی عظمت کا وہ امتیازی نشان ہے جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصول پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔'' اور ''پھر اقبال کے خطاب الہٰ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناح 1940ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور یہ جدوجہد 1947ء میں حصول پاکستان پر منتج ہوئی۔'' یہ سات یا دس سالوں کا عرصہ! اور پھر یہ نتائج! تاریخ انسانیت حیران ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ مزید یہ کہ ہماری بے سروسامانی بھی تو دیکھئے۔ جائزہ ہے کہ

''تحریک پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائداعظم تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کا کمانڈر صرف ایک تھا۔ انہوں نے یہ خطرناک جنگ کس ساز وسامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے ایک اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکریٹریٹ کہاں ہے' فوج کہاں ہے' میرا اسلحہ خانہ کس قدر ہے۔۔ ایک اٹیچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ۔ بس یہ ہے ہمارا ساز وسامان اور اسلحہ اور فوج۔'' مفکر قرآن پرویز صاحب خراج تحسین یوں پیش کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ''اس مرد مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی ہی تھی جس سے انگریز' ہندو اور خود اسلام کے علمبردار لیڈروں کی پیہم اور متحدہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی ہوئی۔''

(طلوع اسلام دسمبر 1984ء)

یہ تو تھی محترم پرویز صاحب کی گواہی۔ اب آخر میں لیجئے دشمن کی گواہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی گواہی سے مستند گواہی اور کس کی ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل انٹرویو دیا کہ ''مسلمانان ہند کو صرف یہ شخص ہی بام ترقی اور بام عروج پر لے گیا ہے۔''

مسٹر ڈینس! میں اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو گیا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں غلط بات نہیں کروں گا۔ میں نے سچ بات من وعن بیان کر دی ہے۔ تقسیم ہند کے ڈرامے کا واحد کردار فقط میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔ تمام سیاسی زندگی میں جس شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا' وہ مسٹر محمد علی جناح کی ذات وشخصیت تھی۔ میں نے ان میں منافقت کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ اتنا بلند کردار انسان اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں کو دوبارہ ملے۔'' (جنگ 24 دسمبر 2001ء)

(جاری ہے)

The Human Self and Allah

Episode No. 1

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

1 The Human Self and Allah

No-one can deny this fact that the basis of religion is on beliefin God. The name of God will changewithin different religions but acceptance of His existence and belief in Him will be the first condition[1] everywhere. From this the questions which necessarily arise are: what is God? What is He like? Why it is necessary to believe in Him? What happens by not believing in Him? What is the mutual relationship between man and God?

1.1 The Importance of this Question

These questions are, as is obvious, very important, very difficult and very sensitive, and since the time that the human consciousness has awakened, it has been busy making effortsin investigating to find a satisfactory answer.

The Quran has also raised the edifice of Deen on the foundations of *Eimaan* in Allah (*Eimaan Billah*). Therefore, these questions which are mentioned above also confront a student of the Quran. Because the importance of these questions was also in front of the Quran, it has therefore provided answers to themwith great detail and emphasis. But it is obvious that each and every individual can only comprehend these kinds oflofty, abstract truths according to his own personal vision and understanding. In the following passages I have attempted to present in brief wordsthat which I have been able to comprehend in this connection according to my own vision. Since (as noted above) this subject is very

[1] There is no doubt in this that some religions e.g. Buddhism are such which deny the existence of God but the state of Buddhists themselves is such that they worship Buddha like a God. Therefore the difference is in name only, the concept being the same everywhere.

difficult and these issues are very delicate, I am sure thatreaders will perusewhatever is saidwith full concentration and interest and will attempt to comprehendit with extreme attention and reflection. It may happen thatas a result of this hard work and endeavour,even greater avenues of Quranic understandingare opened up to us.

If you traverse any period of human history and cast an eye on any part of the earth, you will find that there is one thing every place, every nation and every era has in common, and that is that people will have devised some sort of Being (either a tangible or abstract thing, or an intangible perceptive power) in front of which they bow down, which they worship, and of whose anger or displeasure they are fearful and whose pleasure they consider to be a reason for blessings and approval for themselves. Leaving aside the civilized and developed nations, if you go to such an island where no outsider has previously stepped (according to history), then no matter how different the population residing there may be in other matters, in this common issue their practice too will be equivalent.The famous Greek historian Plutarch (42-107 AD) writes in this regard:

In wandering over the earth, you can find cities without walls, without science, without rulers, without palaces, without treasures, without money, without gymnasium or theatre, but a city without temples to gods, without prayer, oaths and prophecy - such a city no mortal has yet seen and will never see.[1]

1.2 Differences in Concept

Along with this it is also a fact that while such an awarenessexists everywhere about such a power, its concept and details are different in every place. Within even one country the 'god' of one tribe does not match the 'god' of another tribe. The 'God' of one country is different from the 'God' of another country. The 'deity' of one nation is distinct from the 'deity' of another nation. The '*Eishwar*' (idol) of one sect is disparate from the '*Eishwar*' of another sect. Until a short time

[1] W. M. Urban, *Humanity and Deity*, p. 15

previously, the thinking of one group of Western thinkers was that (and it is possible that there may still be supporters of this idea present there) when early man of the initial era observed that some such disasters occurred (e.g. sudden changes in weather, storms and hurricanes, or epidemics of disease etc.) whose causes and remedies were concealed from his eyes and his mind could not grasp them, then there arose in his heart this idea that it could be that there were very great forces present behind these events which were not visible to him. In this way the concept of 'God' was born in the human mind. This concept varied in different countries according to their circumstances and conditions, and in different tribes according to their situation and environment. After this, as time passed and man made continuous progress, this concept also evolved and in this way, gradually, that concept of 'God' came into existence which is presented by the higher religions of the world. This doctrine is called the 'evolution of the concept of God', details of which will be found in Grant Allen's book *The Evolution of the Idea of God*, or in I.G. Frazer's books titled *Golden Bough* etc.

1.3 Repudiationof This

But later thinkers countered this doctrine and asserted that the correct concept of God has always remained the same right from the very beginning. The question of progression and evolution in this simply does not arise. So much so that the modern famous historian, Dr. Arnold Toynbee, has written the following in his book titled *An Historian's Approach to Religion*:

Professor Schmidt's research shows that the concept of the worship of god presented by developed religions is not a new concept which they have invented. The oldest religion of mankind was also this, which has been renewed by developed religions.[1]

Prof. Schmidt's book, *The Origin and Growth of Religion*, from which Dr. Toynbee has quoted the above conclusion, is considered to be the best book on this subject in modern times. In this, he has noted in clear words

[1] A. Toynbee, *An Historian's Approach to Religion*, p. 18

that 'the concept of that higher deity which exists in the early social life of man, was that very same concept which has been presented by the flag bearers of the monotheistic religions. Therefore, it can be stated with certainty regarding most of the oldest tribes of the human race that this was their concept about God too. Hence, the doctrine of evolutionary religion has been proven to be absolutely bankrupt in the whole field of sociology'. Since the subject of our book is not to trace the history of the concept of or belief in God, we do not consider it necessary to elaborate further on this point.

1.4 Concept of the Quran

For the purpose in front of us, it will suffice to say only this, that the Quran has informed us that ever since social consciousness awakened in man, guidance of *Wahi* (Divine revelation) commenced descending through the *Anbiya* [1] from Allah. The focal point of this teaching was the correct concept of God, and it is obvious that when the source of this knowledge (*Wahi*) was only one (God), then this concept will also remain one from the beginning to the end (and was only one). But what used to happen was that a messenger would come and would present this high and supreme concept about Allah with great clarity; after some time, this reality would disappear from the eyes of thepeople, and man, engrossed in his physical senses, would begin mixing the colours of his own thoughts into this clear and transparent concept of Divinity. Sometimes he would make these things his god from which he was afraid and fearful; sometime into those things from which he had some expectations; some time she would erect statues of those mental and imagined gods because of their greatness and holiness and carve idols. Hence, these different gods and goddesses – *Inder*, *Agnee*, sun, moon, Ganges, Jumna, snake, cow, bull – all are varying forms of the manifestation of this sentiment of fear and hope (i.e. of dispelling pain and accruing benefit). When, in this way, the darknesses of superstition enveloped the human mind, then another messenger would come and

[1] *Anbiya* – plural of *Nabi*, which denotes the status of a messenger of Allah as a recipient of *Wahi*. (Ed)

deliver the pure concept of Allah to the people via *Wahi*, and would inform them in clear words that it is the things of the universe which bow to man,not man to the universe: such potentials have been placedin him as a result of which he can harness the things of nature andmake use of these according to his choice. The roar of the oceans, the weightyloads ofthe mountains, the eruptions of the volcanoes deep in the earth, the twinkling lights and movements of the milky way, the fearsome torrents and steady, calmdriftof rivers, the fast and furious gusts of stormy winds, the desolationand awesomeness of petrifying deserts – so much so, that this whole universe and its different and contrastingimagesare,every one of them, standing with their hands tied before man in his service. Therefore, to bow down before these things and to conceive of them as masters and rulers - means what?

Thus, this process of *Wahi* continued in this pattern and form untilthe human mind reached nearer to full adulthood; then this virtuous and pristine, pure and transparent, lofty and supreme concept of Allah was given within the Quran in a complete form, and this heavenly Book was preserved and protected for all times. Therefore, the correct concept of Allah[1] (which Allah Himself has detailed)is within the folds of the Quran in its original and true form (in which there is not an iota of adulteration by the human mind) and is nowhere outside of it. This is because no world religion of today can claim that the book which they call a Divine book is word for word the same one that their messenger received from Allah Himself. Hence, whichever individual wishes that he could obtain that concept about Allah which Allah Himself has detailed, he has no other option except to turn to the Quran for that. The purpose and intentof this book is to explain what is the concept of Allah which is put forward by the Quran.

Continued

[1] This concept of Allah will also lead to the confirmation of His existence. It will become clear as we go through the book that this concept cannot be invented by the human mind. (Ed)

8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔
12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔	دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔
14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔	دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔
15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔	دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
12

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam



اگر ہم اس عظیم مملکت پاکستان کو خوش اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی پوری توجہ لوگوں بالخصوص غریب طبقے کی فلاح و بہبود پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

(قائداعظمؒ کا خطبہ صدارت دستور ساز اسمبلی 1947ء)

قائداعظم نے فرمایا: ''مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کے طرزِ حکومت کا تعین کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے تیرہ سو سال قبل قرآنِ کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔ الحمدللہ! قرآن مجید ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔''

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ 15 نومبر 1942ء)